آنکھ مچولی

اس شمارے کے ساتھ بک مارک مفت حاصل کیجیے

اکتوبر ۱۹۹۰ء

Crystal

آیا کرسٹل زوپیک
سجائیں بھی ہم - مٹائیں بھی ہم - کھیلیں بھی ہم
آیا کرسٹل زوپیک
یہ ہاتھی میرا ساتھی - یہ بطخ ، یہ ہرن اور وہ بلی
کرسٹل زوپیک میں مُفت ملی

کرسٹل

زُوپیک خریدیں - خوبصورت جانور مُفت حاصل کریں

کرسٹل زوپیک ، کرسٹل ٹوتھ پیسٹ کے گرین جل اور وائٹ (دونوں فائقوں) کے ۸۰ گرام والے لارج سائز کے ہر پیکٹ میں ایک عدد خوبصورت جانور بند ہے - ٹوتھ پیسٹ خریدیں اور خوبصورت جانور کا تحفہ مُفت حاصل کریں -

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ۵ شمارہ ۴ ربیع الاول ۱۴۱۱ھ اکتوبر ۱۹۹۰ء فون - ۲۹۹۱۷۸۰

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول
تجمل حسین چشتی

مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیران اعزازی
طاہر مسعود محمد سلیم مغل

مجلس ادارت
شاہ نواز فاروقی ساجد سعید منیر احمد راشد

اشتہارات
محمد عرفان

سرکولیشن
ریاض احمد

- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔
- ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

- ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ ۔ کراچی

خط و کتابت کا پتہ ، ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۱۲۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

قیمت
۱۰ روپے ۷ درہم ۷ ریال

- ۷ — اداریہ — ادارہ
- ۹ — ڈیئر ایڈیٹر — ادارہ
- ۱۳ — نعت — شاہنواز فاروقی
- ۱۴ — وہ نبیوں میں رحمت — عاصم سفیر
- ۲۱ — حیوان موسیقار — جنید شمیم
- ۲۳ — میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا — معین الرحمٰن مرتضیٰ
- ۲۹ — دینِ مساوات — محمد ظہیر الدین
- ۳۴ — جہانِ نو — محمد صالح ارشاد
- ۳۸ — سیکھئے بچوں سے آکر کچھ جناب — محمد سلیم مغل
- ۵۳ — مقابلۂ پہچان — قارئین
- ۵۰ — غزل پزل — اسامہ بن سلیم
- ۴۵ — سیاستدانوں کے نام خط — قارئین
- ۵۶ — دوسرا رُخ — منیر احمد راشد
- ۵۹ — سگریٹ نوشی عادت یا لعنت
- ۶۱ — ڈنڈا ڈولی — قارئین
- ۶۶ — بے چارے بچے — شاہنواز فاروقی

۷۴
بختی
طاہر مسعود

۸۲
غریب کیڑے
ساجد سعید

۸۵
منشی جی کی کار
(نظم)
محمد انوار احمد

۸۷
یہ بھولے بھالے لوگ
سید ذاکر حسین چشتی

۹۲
پیپٹ
سلمیٰ سلیم

۹۴
سفرنامہ بھارت
نیاز احمد مدنی

۱۰۲
دلدل
حمید کاشمیری

۱۰۹
فطرت کی دنیا
شین فاروقی

۱۱۳
معمار
سلمان غزالی

۱۱۷
لباس
غلام عباس طاہر

۱۲۲
یہ انتظار
ثمینہ مظفر

۱۲۵
مقابلۂ مصوری
قارئین

۱۲۷
کم سن قلمکار
قارئین

۱۳۵
روشن مثال
قارئین

۱۴۰
امی ابو کا صفحہ
رُمیصا سلیم

Adarts-JOS-2/89

پہلی بات

ہم پاکستانی لوگ کبھی کبھی یہاں کے دکھوں اور مسائل سے پریشان ہو جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں تعلیم اچھی نہیں ملتی، پینے کے لئے صاف پانی نہیں ملتا، بجلی اچانک چلی جاتی ہے، ٹیلی فون کے لمبے لمبے بل آتے ہیں، بسوں پر لٹک کر سفر کرنا پڑتا ہے۔ جا بجا گندگی کے ڈھیروں پر مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں، کھیلنے کے لئے میدان اور سیر و تفریح کے لئے پارکیں اور باغات نہیں ہیں...... یہاں زندگی کتنی مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ بلکہ یہاں تو زندگی محفوظ بھی نہیں ہے۔ آئے دن لوگ بے قصور مار دیئے جاتے ہیں اور جب یہ سب کچھ ہے تو پھر اس ملک میں رہنے کا فائدہ کیا ہے؟ یہی سوچ کر اب تک لاکھوں لوگ اس ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا چکے ہیں۔ ان ملکوں میں جہاں انہیں اچھی نوکری مل جاتی ہے اور وہ خوشحال زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار جب وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملنے یہاں آتے ہیں تو یہاں کی بدانتظامی اور بدحالی کو مایوسی اور بسا اوقات حقارت سے دیکھتے ہیں اور ہمیں باہر کے قصے سنانے لگتے ہیں جیسے باہر کی دنیا جنّت اور ان کا اپنا ملک جہنم ہو۔

کویت بھی ان ملکوں میں شامل تھا جہاں ایسے ہزاروں پاکستانی آباد تھے اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو وہاں مقیم پاکستانی بری طرح متاثر ہوئے۔ اخبارات بتاتے ہیں کہ وہ سخت پریشاں حالی کا شکار ہیں اور کسی طرح پاکستان پہنچنے کے لئے بیتاب ہیں...... اور اب پاکستانی طیاروں کے ذریعے ان کی وطن واپسی شروع ہو چکی ہے۔ وطن کے دروازے آج بھی ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اپنا ملک پھر اپنا ہوتا ہے۔ آپ اجنبی ملک میں کتنے ہی آسودہ حال ہوں لیکن وہاں آپ کی حیثیت بہرحال دوسرے درجے کے شہری کی ہوتی ہے۔ اپنے ملک کے دکھ بھی گوارا ہوتے ہیں لیکن اجنبی ملک کی معمولی تکلیف بھی چبھنے لگتی ہے۔۔

کویت سے آنے والے بے سروسامان پاکستانیوں میں وہ ہزاروں بچے بھی شامل ہیں جو وہاں اپنے والدین کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ جب وہ اپنے وطن لوٹیں گے تو ممکن ہے تعلیمی اداروں میں داخلے بند ہو چکے ہوں، ان کے پاس وہاں کے اسکولوں کے سرٹیفکیٹ نہ ہوں اور مسئلے مسائل بھی ہوں۔ ایسی صورت میں ان کے تعلیمی سال ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اچانک معیار زندگی بدل جانے کی وجہ سے وہ ویسے بھی پریشانیوں اور الجھنوں کا شکار ہوں گے۔ لہٰذا ہماری حکومت اور محکمہ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ان بچوں کے تعلیمی مستقبل کی حفاظت کا بندوبست کرے۔ تعلیمی اداروں میں ان کے فوری داخلے کی پالیسی بنائی جائے اور کسی بھی طرح اس اہم مسئلے کے حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔ کیونکہ آنے والے بچے بہرحال پاکستانی ہیں اور ان کی فکر بھی پاکستان ہی کو کرنی ہوگی۔

ظفر محمود شیخ

بچے

جنہیں ہمیشہ بچہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے
جنہیں کم سن سمجھ کر کبھی خاطر میں نہیں لایا جاتا
جنہیں بڑے کارناموں کا اہل نہیں سمجھا جاتا

انہی بچوں کے بارے میں
انوکھی معلومات اور حیرت انگیز انکشافات لیئے ہوئے بچوں کو اپنی تحریروں کا محور بنا کر

آنکھ مچولی کا خصوصی شمارہ اب جنوری ۱۹۹۱ء میں شائع ہو رہا ہے۔

ہر قابل اشاعت تحریر پر معاوضہ ہر قابل قدر تحریر پر تحائف
اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار۔ ایک اچھوتی اور منفرد اشاعت۔

☆

ذہین ترین بچوں کا تعارف بچوں کے کارہائے نمایاں تاریخ کے عظیم ترین بچے
بچے جنھوں نے بڑوں کو مات دے دی دیس دیس کے بچے۔ نگر نگر کے بچے
بچوں سے متعلق، گیت، کہانیاں، مضامین و معلومات۔ تحریریں اور تصاویر

بچوں کے حوالے سے آپ بھی لکھیئے

خاص نمبر کا عنوان تجویز کیجئے

اور خوبصورت انعامات کے علاوہ ایک سال کے لئے آنکھ مچولی مفت حاصل کیجئے۔

اپنی تحریریں اور تجاویز اس پتے پر بھجوائیے
آنکھ مچولی "اطفال نمبر ۱۱۔ ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

ڈیئر ایڈیٹر

محمد آمین ..... راولپنڈی کل۔ میری خواہش ہے کہ ماہنامہ آنکھ مچولی کے آرٹسٹ صاحب سے آپ قائداعظمؒ کی ایک تصویر بنوائیں اور اس میں میری تصویر بھی ان کے ساتھ ہو۔ اگر آپ تیار ہوں تو میں اپنی تصویر آپ کو بھیج دوں۔

○ ..... بھئی آپ کی خواہش تو بہت اچھی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قائداعظم بہت اصول پسند انسان تھے وہ تصویر بنوانے سے پہلے یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ طالب علم کیسے ہیں؟ والدین اور اساتذہ کی رائے آپ کے بارے میں کیسی ہے؟ آپ میں سچائی ایمانداری اور دیگر اچھی باتیں کتنی ہیں؟ قائداعظم میں جو خوبیاں تھیں انھیں آپ اپنانے کی کوشش کرتے ہیں؟ اگر یہ سب باتیں آپ میں ہیں تو پھر آپ کی تصویر قائداعظم کے ساتھ اچھی لگے گی۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا۔

شازیہ عزیز ..... شاہ فیصل کالونی، کراچی۔ بھائی جان آپ دوسروں کے بنائے ہوئے کارٹون، خاکے تو بہت جلد شائع کر دیتے ہیں مگر میری بھیجی ہوئی ہر چیز ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہے میں نے سگریٹ نوشی کے خلاف ایک کارٹون بھیجا تھا جس میں سگریٹ کو خزاں کے درخت سے تشبیہ دی تھی اس کا کیا بنا؟

○ ..... آپ کا کارٹون ہماری نظر سے نہیں گزرا مگر اب تو اس درخت پر پھل پھول اور پتے آچکے ہوں

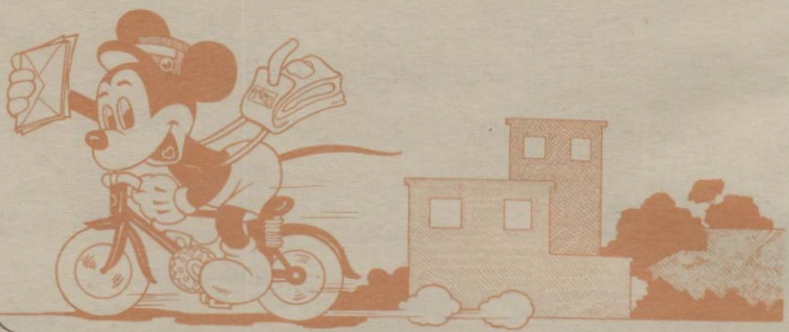

گے اتنے دن جو ہو گئے۔

عبدالقیوم فتح محمد قریشی ..... پھلیلی حیدر آباد :۔ اگر آپ آنکھ مچولی میں کچھ چھپوانا چاہتے ہیں تو اپنی تحریر لکھنے کے بعد اسے حسرت کی دھیمی آنچ پر رکھیں اس میں سلگتے ارمان اور تھوڑی سی ناکام تمنائیں شامل کر لیں جب اس میں سے ٹھنڈی آہیں نکلنا شروع ہو جائیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی تحریر رسالہ کی زینت بننے والی ہے۔

○ ..... اور جب پھر بھی تحریر شائع نہ ہو تو اس میں شکایتوں کا مرچ مسالہ ڈال دیجئے اور دھمکیوں کا بھگارا کر بدتمیزی کی آنچ تیز کر دیجئے انشاءاللہ تحریر شائع ہو جائے گی اور اگر نہ ہوئی تو کم سے کم آپ کے دل کا غبار تو دھل جائے گا۔

نازیہ امجد ..... علامہ اقبال ٹاؤن ، کراچی :۔ جولائی میں ہوائیوں ، میں اپنا مرسلہ دیکھ کر خوش ہوئی لیکن یہ دیکھ کر کوفت ہوئی کہ میرا نام شازیہ امجد غلطی سے چھپ گیا۔ براہ کرم تصحیح کر دیجئے۔

○ ..... اے بہن کاش! آپ کا نام شازیہ امجد ہوتا تو آج ہمیں آپ سے معذرت تو نہ کرنی پڑتی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کا نام شازیہ امجد ہوتا تو رسالے میں نازیہ امجد چھپتا اور معذرت ہمیں پھر بھی کرنی پڑتی خیر درگزر کیجئے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔

محمود ظفر مہناس ..... خانیوال :۔ دل دل پاکستان میں میرا نام ظفر محمود مہناس شائع ہو گیا ہے۔ مہربانی فرما کر تصحیح کر دیجئے۔

○ ..... لیجئے صاحب آپ نے تصحیح خود ہی کر دی ۔ باقی ہماری طرف سے اوپر والا جواب پڑھ لیجئے۔

شمس الحق قذافی ..... بوریوالہ وہاڑی :۔ یہ جو آپ نے رسالے کے آخر میں ٹینڈر نوٹس دے دیئے ہیں ان کا آنکھ مچولی اور بچوں سے کیا تعلق ہے؟

○ ..... آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ ٹینڈر نوٹس کماؤ پوت ہیں کماؤ پوت سمجھتے ہیں آپ؟

عذرا ناز ..... کراچی :۔ انکل! ایوارڈ ملنے کی خوشی میں مٹھائی کب کھلا رہے ہیں؟

○ ..... مٹھائی ، اوہ ہاں ..... آپ نے کیا فرمایا؟ مٹھائی ..... بہت خوب انشاءاللہ ضرور ..... معاف کیجئے آپ نے کیا کہا؟ بھلا ہم سمجھے نہیں۔

تنویر شہزاد ..... بہاولپور :۔ "عجیب پاگل" کے نقل شدہ ہونے کی خبر میں نے دی تھی لیکن آپ نے میرا نام دوسروں کے ساتھ شائع نہیں کیا۔

○ ..... دوسروں کی خامیاں اور برائیاں تلاش کرنا اچھی بات نہیں ہے اس لئے اچھا ہی ہوا کہ آپ کا نام

نہیں چھپا۔

علی نواز شیخ حسّام ..... سنجھورو میں آنکھ مچولی خریدنے دکان پر گیا تو وہاں ایک غریب لڑکا پہلے سے موجود تھا وہ بہت مایوس تھا کیونکہ اس کے پاس صرف دس روپے تھے اس نے مجھے بتایا کہ اسے آنکھ مچولی پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن وہ غریب ہے اور اس کے پاس آٹھ روپے نہیں ہیں یہ سن کر مجھے آپ پر بہت غصہ آیا میں نے رسالہ خرید کر اسے دے دیا لیکن یہ آپ کو سوچنا چاہئے کہ کتنے لڑکے صرف غریب ہونے کی وجہ سے آپ کا رسالہ نہیں پڑھ پاتے ہوں گے۔

○ ..... واقعی یہ بڑے دکھ کی بات ہے لیکن آپ ہی بتائیے کہ جس معیار کا ہم رسالہ نکالتے ہیں کیا اس کی قیمت کم کر کے معیار کو گھٹا دیں۔ یہ آپ لوگوں کو منظور ہو گا؟ ہم تحفے نہ دیں؟ رنگین صفحات ختم کر دیں؟ لکھنے والوں کو معاوضہ دینا بند کر دیں؟ آئے دن کے انعامی سلسلے بھی اڑا دیں اور پھر آنکھ مچولی ایک عام سا سستا رسالہ بنا دیں۔ اگر آپ سب اس کے لئے تیار ہیں تو پھر اس پر سوچا جا سکتا ہے اور اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو پھر آپ کا فرض بھی ہے کہ ایسے بچوں کی مدد کریں جو آنکھ مچولی نہیں خرید سکتے آپ انھیں اپنا رسالہ پڑھنے کے لئے دے سکتے ہیں وہ خود بھی عملاً لائبریریوں سے کرائے پر رسالہ لے سکتے ہیں اور ہم بھی کسی ایسی اسکیم پر غور کر سکتے ہیں جس میں غریب بچوں کی پہنچ آنکھ مچولی تک آسان بنائی جا سکے۔

دل دل پاکستان ..... زندہ باد

محمد اظفر ..... ملیر ہالٹ کراچی دل دل پاکستان کا سرورق نہایت خوب صورت اور منفرد تھا۔ تزئین و آرائش بھی۔ حسن ترتیب دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ابو تراب کی پینٹنگز دیکھیں تو بے اختیار داد دینے کو دل چاہا۔ البتہ قیمت زیادہ تھی۔

خاور رضا ..... لاہور میتین الرحمٰن مرتضیٰ صاحب کی تحریر "میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا" پڑھ کر سوچنے لگا کہ ہمارے بڑوں نے کس جدوجہد حوصلے اور قربانی سے یہ آزادی حاصل کی ہے اب اس کا دفاع ہمارا فرض ہے۔

شوکت جاوید ..... کراچی اگست کا شمارہ پڑھا مسلمانوں پر ہندوؤں کے مظالم پڑھ کر جسم کا رواں رواں کانپنے لگا اور دل جذبہ آزادی سے لبریز ہو گیا اور سوچنے لگا کہ ہمیں آزادی کی قدر کیوں نہیں ہے؟

ممتاز حبیب صابر ..... مردان بدل دل پاکستان کی قیمت سن کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر دل پر جبر کر کے اور حاتم طائی کو شرمندہ کر کے رسالہ خریدا کیا کریں جی اس کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔

ریاض احمد سولنگی ..... کوٹری بدل دل پاکستان اتنا اچھا تھا کہ پیارے وطن سے پہلے سے زیادہ محبت ہو گئی۔

شمشیر علی ..... کراچی یہ احساس ہوا کہ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن آج ہمیں اس کی قدر و قیمت کا احساس نہیں۔

حمیرا فلک ناز مریم ..... دستگیر سوسائٹی کراچی اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ تمام مضامین اور نظمیں اپنی مثال آپ تھیں۔

صائمہ انصاری ..... لطیف آباد حیدر آباد رسالہ اگست کی ۷ تاریخ کو ملا آخر اتنی تاخیر کیوں ہو گئی

○ ..... ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔

کاغذ نہ موڑیں

کتابیں علمی خزانہ ہیں
کتابیں قیمتی سرمایہ ہیں

کتاب یا رسالہ پڑھتے ہوئے صفحات موڑنا
آپ کی کتاب دوستی کو مشکوک بناتا ہے

ان کی حفاظت کیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی کی طرف سے دیا جانے والا خوبصورت بک مارک ..... ضرورت پڑنے پر استعمال کیجئے۔

قرآن پاک، کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتے ہوئے اگر نشانی لگانا مقصود ہو تو صفحہ موڑنے کے بجائے "بک مارک" استعمال کیجئے۔

یہ خوبصورت بک مارک ..... آپ کے لئے آنکھ مچولی کا تحفہ بھی ہے

اور تحفظ سرمایۂ کتب کا پیغام بھی۔

نعتِ رسولِ مقبول

شاہ نواز فاروقی

جیسے انگشتری نگینے سے
ایسے ہے یہ جہاں مدینے سے
ان ؐ کے رستے پہ گر چلیں سب لوگ
ساری دنیا رہے قرینے سے
نام لیتے ہی آپؐ کا اکثر
روشنی پھوٹتی ہے سینے سے
آپؐ کے ایک قول کی قیمت
ہے زیادہ ہر اک خزینے سے
آپ ؐ کی فکر سے جو عاری ہو
موت بہتر ہے ایسے جینے سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

انسان کامل

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انسان کامل ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں اور کمالات پائے جاتے ہیں جن کا ایک نیا انسان تصور کر سکتا ہے۔ آپ جیسی بالکل صفات رکھنے والا نہ کوئی انسان دنیا میں اب تک آیا ہے، نہ آئندہ کوئی آئے گا۔ آپ کی ہستی تمام حیثیتوں میں کامل تھی۔ بحیثیت باپ، بحیثیت شوہر، بحیثیت تاجر، بحیثیت پڑوسی، بحیثیت حکمراں، بحیثیت سپہ سالار۔ غرض کہ آپ اپنی ہر حیثیت میں تمام انسانوں سے برتر اور برگزیدہ ہیں۔

نمایاں امتیاز

آپ امی تھے۔ کچھ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ نہ انسانوں میں سے کوئی آپ کا معلم اور استاد تھا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے علوم عطا فرمائے تھے جو اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات میں کسی اور کو نہیں دیئے۔ آپ کو زمین کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں لیکن آپ نے دنیا کی مال و دولت کے بجائے ہمیشہ آخرت کو ترجیح دی۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ آپ علم و حکمت کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ سب سے زیادہ محترم، سب سے زیادہ منصف، سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور سب سے زیادہ پاک دامن اور لوگوں کو سے زیادہ نفع پہنچانے والے اور لوگوں کی طرف سے اذیت پہنچنے پر سب سے زیادہ صبر و تحمل کرنے والے تھے۔

چہرہ مبارک

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور سے زیادہ کسی کو خوبصورت نہیں دیکھا۔ گویا آپ

کے رخسار مبارک میں سورج تیر رہا ہے جب آپ مسکراتے تھے تو دیواروں پر اس کی چمک پڑتی تھی۔ سیدنا حسانؓ بن ثابتؓ نے اپنی ایک نعت میں لکھا تھا۔

"میری آنکھوں نے کبھی آپ سے زیادہ حسین نہیں دیکھا
عورتوں نے آپ سے زیادہ کوئی صاحب کمال نہیں جنا
آپ کو ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا ہے
جیسے آپ اپنی مرضی کے مطابق پیدا کئے گئے ہوں

عفو و درگزر

آپؐ نے کبھی بھی اپنے ذاتی معاملہ اور مال و دولت کے سلسلہ میں کسی سے انتقام نہیں لیا۔ مگر اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا تو اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے بدلہ لیا۔ جنگ احد میں جب کفار نے آپؐ کو شدید ترین رنج پہنچایا تو آپؐ نے اللہ سے دعا کی:

"اے اللہ میری قوم کو راہ راست پر لا، کیونکہ وہ جانتے نہیں۔" اور جب صحابہ نے کہا "یارسول اللہ کاش آپؐ ان پر بد دعا فرماتے تاکہ وہ ہلاک ہو جاتے۔ آپؐ نے جواب دیا: "میں لعنت کے لئے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ میں حق کی دعوت اور دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"

صبر و استقامت

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ کے راستے میں مجھے اتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا اور اللہ کی راہ میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو نہیں ستایا گیا اور ایک دفعہ میں رات دن تک مجھ پر اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال کے لئے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے سوائے اس کے جو بلالؓ نے اپنی بغل کے اندر چھپا رکھا تھا۔

واقعہ طائف

حضورؐ اسلام کی تبلیغ کے لئے طائف پہنچے۔ وہاں کے سرداروں نے اپنے شہر کے لڑکوں کو سکھا دیا۔ جب آپؐ وعظ کے لئے کھڑے ہوتے تو وہ لوگ آپؐ پر اتنے پتھر پھینکتے کہ حضورؐ لہولہان ہو جاتے۔ خون بہہ بہہ کر جوتوں میں جم جاتا اور وضو کے لئے پاؤں جوتے سے نکالنا دشوار ہو جاتا۔ اس مقام پر ایک دفعہ وعظ کہتے ہوئے آپؐ کو اتنی چوٹیں آئیں کہ آپؐ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اتنی تکلیفیں سہنے اور دکھ اٹھانے کے بعد بھی آپؐ نے طائف سے واپس ہوتے ہوئے فرمایا: "میں ان لوگوں کی تباہی کے لئے کیوں دعا کروں۔ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ امید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ضرور اللہ واحد پر ایمان لانے والی ہوں گی۔"

فتح کے بعد

کفار مکہ اکیس سال تک رسول اکرمؐ اور آپ کے ماننے والوں کو ستاتے رہے۔ حتیٰ کہ آپؐ کو گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی لیکن جب مکہ فتح ہوا تو وہ تمام ظلم ڈھانے والے کفار قریش خوف و ندامت سے سر جھکائے ہوئے آپؐ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپؐ نے پوچھا:

"تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔"

انہوں نے دبی زبان سے جواب دیا:

"اے صادق، اے امین۔ تم ہمارے شریف بھائی اور شریف برادر زادے ہو، ہم نے ہمیشہ تمہیں رحم دل پایا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا: "آج میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔"

حضورؐ نے فرمایا: "تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ، آج تم سب آزاد ہو۔"

وعدے کی پابندی

جنگِ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور مسلمانوں کو ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی۔ حذیفہ بن ایمانؓ اور ابو حیلؓ دو صحابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ ہم مکہ سے آرہے ہیں۔ راستے میں کفار نے ہم کو گرفتار کر لیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپؐ کا ساتھ نہ دیں گے۔ لیکن یہ مجبوری کا عہد تھا۔ ہم ضرور کافروں سے لڑیں گے۔" حضور نے فرمایا: "ہرگز نہیں تم اپنا وعدہ پورا کرو اور لڑائی کے میدان سے واپس چلے جاؤ۔ ہم (مسلمان) ہر حال میں وعدہ پورا کریں گے۔ ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔"

فیاضی

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ خود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے چادر پیش کی۔ چونکہ آپؐ کو چادر کی سخت ضرورت تھی اس لئے آپؐ نے پہنی۔ اس وقت ایک شخص نے مانگ لی۔ آپؐ نے دے دی۔ آپؐ قرض لے کر ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے تھے اور قرض خواہوں کے تقاضے کے وقت کہیں سے اگر کچھ آگیا اور قرض ادا کرنے کے بعد بچ گیا تو جب تک وہ سب تقسیم نہ جاتا گھر میں تشریف نہ لے جاتے۔

انکساری و خوش مزاجی

آپ کی طبیعت نرم اور مزاج دھیما تھا۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے تھے بلکہ معاف فرماتے

تھے۔ حیا اتنی تھی کہ آپ کی نگاہ کسی شخص کے چہرے پر نہ ٹھہرتی تھی اور کسی نامناسب بات کا اگر کسی سے ذکر کرنا ضروری ہو جاتا تو علیحدگی میں اس سے وہ بات کہتے تھے۔ تاکہ وہ اپنی بے عزتی محسوس نہ کرے۔ جو شخص آپؐ کی دعوت کرتا اسے قبول فرماتے تھے۔ محفل میں کبھی پاؤں نہیں پھیلاتے کہ جس سے اوروں پر جگہ تنگ ہو جائے۔ جو آپ کے پاس آتا اس کی تواضع کرتے۔ بعض اوقات اپنا کپڑا اس کے بیٹھنے کے لئے بچھا دیتے۔ کسی شخص کی بات بیچ میں نہ کاٹتے۔ خوش مزاجی میں سب سے بڑھ کر تھے۔

ایک مرتبہ ایک سفر میں چند صحابہؓ نے ایک بکرا ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا اور اس کا کام آپس میں تقسیم کر لیا۔ ایک نے بکری ذبح کرنے کا ذمہ لیا، دوسرے نے کھال نکالنے کا۔ آپؐ نے فرمایا: پکانے کے لئے لکڑی اکٹھا کرنا میرے ذمہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! یہ کام ہم خود کریں گے۔ آپ نے فرمایا: "یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اس کو بخوشی کرا لو گے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں لوگوں میں ممتاز رہوں اور اللہ تعالیٰ بھی اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔"

بچّوں سے شفقت

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپؐ کی خدمت اس وقت سے کی جب میری عمر صرف آٹھ برس کی تھی اور میں دس برس تک آپ کی خدمت کرتا رہا لیکن اتنے طویل عرصے میں آپؐ نے کبھی میری کسی غلطی پر ملامت نہیں کی اگر کسی نے ملامت کی تو آپؐ نے فرمایا: "اس کو چھوڑ دو۔ اگر تقدیر میں کوئی بات ہوتی ہے تو ہو کر رہتی ہے۔" آپؐ جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو خود ان کو سلام کرتے تھے۔

رحم دلی

ایک دفعہ اک صحابیؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے بچے تھے اور وہ چیں چیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا: "یہ بچے کیسے ہیں؟"

صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ میں ایک جھاڑی کے قریب سے گزرا تو ان بچوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں ان کو نکال لیا۔ ان کی ماں نے دیکھا تو بیتاب ہو کر سر پر چکر کاٹنے لگی۔ آپؐ نے فرمایا: "فوراً جاؤ اور ان بچوں کو وہیں رکھ آؤ جہاں سے لائے ہو۔"

ایک دفعہ حضرت مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے۔ اتفاق سے رسول اکرمؐ اس موقع پر تشریف لائے۔ آپؐ نے رنجیدہ ہو کر فرمایا: "ابو مسعود اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔"

حضرت ابو مسعودؓ یہ سن کر تھرا اٹھے اور عرض کیا:
"یارسول اللہ میں اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں۔"
"آپؐ نے فرمایا: "اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تم کو چھو لیتی۔"

عظمت کی معراج

آپؐ کی عظمت اور بڑائی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً اپنے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کا سب کا خیال رکھتے۔ ان کے حالات دریافت کرتے رہتے۔ جب رات کے وقت باہر جانا ہوتا تو آہستہ سے اٹھتے اور آہستگی سے کواڑ کھول کر چلے جاتے تاکہ سونے والوں کو تکلیف نہ ہو اور کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ جب کوئی آپ کے پاس آتا اور آپؐ اس کو خوش و خرم دیکھتے تو اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتے تاکہ قربت محسوس ہو۔

جب آپؐ کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو دروازے کے سامنے کھڑے نہ ہوتے بلکہ بائیں یا دائیں جانب کھڑے ہوتے اور گھر والوں کی اطلاع کے لئے فرماتے۔ "اسلام علیکم"

آپؐ اکثر اوقات خاموش رہتے۔ بلا ضرورت باتیں نہ کرتے۔ جب بولتے تو اتنا صاف کہ سننے والا خوب سمجھ لے۔ نہ اتنی لمبی باتیں کرتے کہ آدمی اکتا جائے اور نا اتنا مختصر کہ بات ادھوری رہ جائے۔ کسی بات میں کسی کام میں سختی نہ فرماتے۔ نرمی کو پسند فرماتے۔ اپنے پاس آنے والے کی بے قدری نہ فرماتے۔ کسی چیز کے ٹوٹ جانے یا کسی کام کے بگڑ جانے پر آپ کو غصہ نہ آتا تھا۔ البتہ اگر کوئی بات دین کے خلاف ہوتی تو آپؐ کو سخت غصہ آتا تھا۔

کسی سے ناراضگی کا اظہار کرنا ہوتا تو چہرے کو اس کی طرف سے پھیر لیتے تھے لیکن زبان سے سخت سست نہیں کہتے۔ جب خوش ہوتے تو نیچی نگاہ کر لیتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً آپ کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو آپؐ اس کو بلا تکلف بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی اس بدلے کوئی چیز عطا فرما دیتے۔

اگر کوئی غریب آتا یا کوئی باندی یا بڑھیا آپؐ سے بات کرنا چاہتی تو سڑک کے ایک کنارے پر سننے کے لئے کھڑے ہو جاتے یا بیٹھ جاتے۔ بیمار ہوتا تو دیکھنے جاتے، کسی کا جنازہ ہوتا تو اس میں شریک ہو جاتے۔ اگر کبھی کوئی غم ہوتا تو فرماتے:

"میرے لئے اللہ رب العزت کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔" آپؐ کی رحمتیں بے شمار ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

(بحوالہ اسوۂ رسول اکرمؐ از ڈاکٹر محمد عبدالحئی)

سب دوستوں کے لئے ایک دوستانہ مشورہ

پیارے دوستو!

آپ کی طرح مجھے بھی سوئیٹس، ٹافیز اور ببل بے حد پسند ہیں لیکن میں خریدتے وقت بہت احتیاط سے کام لیتی ہوں اور صرف مے فیئر خریدتی ہوں۔ کیونکہ یہ بہترین اجزا سے صحت کے اصولوں پر تیار ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزیدار ہیں۔

——— آپ سب دوستوں کے لئے، میرا دوستانہ مشورہ ———

ہمیشہ مے فیئر کی سوئیٹس اور ٹافیز کھائیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔

■ مے فیئر سوئیٹس اور ٹافیز ■ مے فیئر ببل ■ مے فیئر ملکا چیو

■ مے فیئر فروٹا چیو (اورنج اور اسٹرابیری)

mayfair

دیکھ کر پڑتا ہے کرنا اعتبار   بن گئے حیوان بھی اب موسیقار

اپنی دُھن میں رہتا ہوں

چھیچھڑوں کی یاد میں
ہے میری دُھن

کتّے کا ترانہ ہے
ذرا غور
سے سُنیئے

جُنید شمیم

کہتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔ یہ بات شاید کسی زمانے میں درست ہو۔ مگر آج کے زمانے میں نہیں۔ آج تو جب ہم ٹی وی پر نوجوان فنکاروں کو اچھل کود کرتے دیکھتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ موسیقی روح کی نہیں بدروح کی غذا ہے۔

اس بات کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اب بعض حیوانات بھی موسیقی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ان حیوانات کی توجہ کا عالم یہ ہے کہ وہ صرف موسیقی سنتے ہی نہیں بلکہ موسیقی کے آلات بجاتے بھی ہیں۔

روس میں ایسے حیوانات کا ایک تھیٹر موجود ہے۔ اس تھیٹر میں حیوانات موسیقی کے آلات بجانے کے علاوہ دیگر کرتب بھی دکھاتے ہیں۔ دنیا میں اپنی نوعیت کا یہ واحد تھیٹر ہے..... اس تھیٹر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں عام پالتو جانور جیسے کتا بلی وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس تھیٹر کی نگران کا نام مادام دوروا ہے۔ یہ مادام دوروا کا خاندانی کام ہے۔

مادام کے اس تھیٹر میں اکثر حیوانات اتفاق سے آتے ہیں مثال کے طور پر ایک چمپنزی صاحب غلطی سے کسی دوسرے ملک سے کیلوں کے جہاز میں سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔

جو شخص مادام کے پاس کوئی حیوان لے کر جاتا ہے مادام اسے بخوشی قبول کر لیتی ہیں۔ مادام کے تھیٹر کا سب سے بوڑھا ایکٹر ایک سمندری شیر ہے۔ جس کی عمر ۱۷ برس ہے۔ اگرچہ یہ شیر تقریباً اندھا ہے مگر یہ والی بال کھیلتا ہے اور ڈرم بجالیتا ہے۔

مادام کے دادا نے اس تھیٹر کا آغاز آج سے ۷۰ برس قبل کیا تھا۔ اس وقت جانوروں کو سدھانے والے حضرات انہیں سزا دے کر سدھاتے تھے لیکن مادام کے دادا نے جانوروں کو محبت اور انعام دے کر سدھانے کا طریقہ ایجاد کیا۔

مادام نے حیوانات کو سدھانے کا آغاز اس وقت کیا جب ان کی عمر صرف ۴ برس تھی۔ بہت سے لوگ یہ دیکھ کر مادام کے والد کو برا بھلا کہتے تھے ان کا خیال تھا کہ اتنی چھوٹی سی بچی کو حیوانات کے پاس لے جا کر مادام کے والد مادام کی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ مگر مادام کے والد کو اپنی محبت پر بھروسہ تھا اور جانوروں نے کبھی مادام کے والد کو اپنی محبت پر نادم نہیں کیا۔

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ان لوگوں کی توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں کم از کم حیوانوں سے تو بہتر ہونا چاہئے! ہیں نا؟

یہ لکیریں ہیں سمجھنے کی ۔ نہ سمجھانے کی

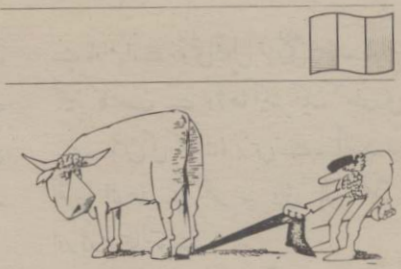

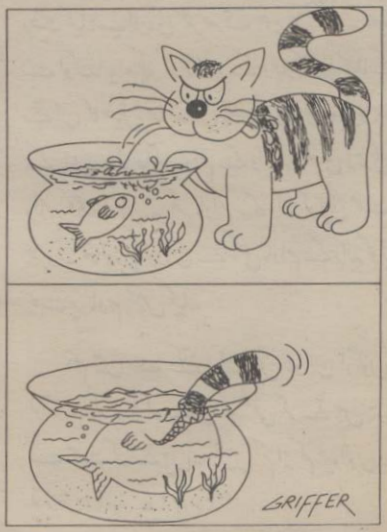

آخری قسط

میں نے پاکستان بنتے کیسے دیکھا؟

متین الرحمٰن مرتضیٰ

جب پاکستان بنا تو میں سات برس کا تھا۔ ہمارا گھر پٹیالہ کے تاریخی مقام بھٹنڈہ میں تھا۔ ہمارے ابو علاقے کے سینیٹری آفیسر تھے۔ عید کی آمد آمد تھی لیکن اس بار کچھ مزے دار عید نہیں تھی... شہر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے اور دن بھر گولیاں چلتی رہتی تھیں... کئی بار میں اور میرا چھوٹا بھائی معین، گولی لگنے سے بال بال بچے۔ پھر ایک دن ہم لوگوں نے اپنا گھر چھوڑا اور ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف سفر کا آغاز کیا، مگر راستے میں قافلے پر حملہ ہونے کی وجہ سے ہم دونوں بھائی اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئے... قافلہ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ جس حصے میں ہم تھے اُس میں عورتیں اور بچے زیادہ تھے... ہمیں مسلمانوں کے ایک قریبی گاؤں تک پہنچنا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو سکھ بلوائی اُس گاؤں میں قتلِ عام کر کے آگ لگا چکے تھے۔ ہمارے قافلے والوں کو بھی انہوں نے قتل کر دیا... میں اور معین لاشوں کے نیچے دب جانے کی وجہ سے بچ گئے... ہم لوگ وہاں سے بھاگے اور قریب ہی واقع باجرے کے کھیتوں میں چھپ گئے۔

ہم کئی روز اُن کھیتوں میں رہے۔ دن بھر گرمی اور حبس میں کھیت کے درمیان ایک گڑھے میں چھپے رہتے اور رات کو کھیت سے باہر نکلتے۔ یہ دن بڑے خوف کے عالم میں بیتے۔ پسینے، خون اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑوں کا بُرا حال تھا۔ ایک دن ہم دونوں بھائی ہمت کر کے نالے تک آئے اور کپڑے دھو کر اور خوب نہا کر ذرا دیر کے لئے وہیں نالے کے کنارے بیٹھ گئے۔ نالے میں ہم لوگوں نے ایک بوسیدہ سی لاش دیکھی جس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور اُس میں سے گندگی نکل نکل کر پانی میں ایک الگ رنگ کی لکیر سی بنا رہی تھی۔ وہیں ہمیں چند سکھوں نے پکڑ لیا اور میرے کندھے میں نیزہ لگنے سے زخم آ گیا۔ معین سمجھا کہ مجھے قتل کیا جا رہا ہے۔ وہ ڈر کے مارے چیختا ہوا بھاگ گیا۔ سکھ مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم دونوں بھائی دو دن تک ایک دوسرے سے جُدا رہے۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ایک نیک دل بڑی بی سے ہوئی جنہوں نے بالکل ہمیں ماں کی طرح ہمیں پیار دیا۔ اس بڑی بی کے ساتھ دو لاوارث بچے اور بھی تھے۔ ہم سب لوگ ریلوے لائن کے ساتھ چلتے ہوئے ایک بستی میں پہنچے۔ اس بستی کا سردار ایک نیک دل بوڑھا سکھ تھا۔ اُس کی حویلی میں ہماری ملاقات اُن بہت سے لوگوں سے ہوئی جو پہلے ہمارے قافلے میں شامل تھے۔

اس نیک دل سکھ نے ان زخمیوں کو اپنے یہاں پناہ دے رکھی تھی۔ زخمیوں کو دیکھ کر میں نے اور معین نے خوف زدہ ہو کر رونا شروع کر دیا بڑی بی اور بہت سے دوسرے لوگوں نے ہمیں تسلی دی اور سمجھایا کہ یہ سکھ جن کے گھر ہم پہنچے ہیں مارنے والے نہیں بچانے والے سکھ ہیں۔اچھے اور نیک لوگ ہیں یہاں زخمیوں کا دیہاتی طریقے سے علاج بھی ہو رہا تھا۔ ایک سکھ کے ہاتھ میں بالٹی تھی جس میں ہلدی گھلی ہوی تھی اور اس میں کچھ اور بھی ملایا گیا تھا۔ یہ دیسی مرہم تھا جو زخموں پر لگایا جا رہا تھا۔ دوسرے زخمیوں کے ساتھ ساتھ میرے کندھے کے زخم پر بھی ہلدی کا لیپ کیا گیا۔ ہماری دکھتی آنکھوں میں رسوت ڈالی گئی۔

سورج غروب ہونے سے پہلے تمام لوگوں میں بچوں کے لئے آدھی آدھی اور بڑوں کے لئے ایک ایک باجرے کی روٹی تھوڑے تھوڑے گڑ کے ساتھ تقسیم ہوئی نہ جانے کتنے دنوں بعد گڑ سے روٹی کھانے کو نصیب ہوئی تھی اور بعد میں لسی کا پیالہ بھی پینے کو ملا۔ مزہ آگیا۔

ہمیں رات کو سونے کے لئے جگہ صحن کے اس کنارے میں ملی جہاں قریب ہی مویشی بندھے ہوئے تھے۔ رات میں کروٹ بدلتے ہوئے ہم اپنے بوریئے والے بستر سے دور مویشیوں کے پاس جا پہنچے تھے اور گوبر میں بری طرح سن گئے تھے۔ صبح اٹھے تو ہماری یہ حالت دیکھ کر سب ہم پر ہنس رہے تھے۔ سکھ سردار ہاتھ سے پکڑ کر ایک عورت کے پاس لئے گیا جو اس کی بیٹی یا بہو تھی۔ اس عورت کے حوالے کرتے ہوئے سردار جی نے کہا۔ "ان بچوں کو اچھی طرح نہلاؤ دھلاؤ۔ انہیں ہم اپنے پاس ہی رکھیں گے بڑے ہو کر تگڑے جوان ہوں گے اور ہماری بھینیں چرایا کریں گے!"

وہ کلدیپ کور ہمیں کنوئیں پر لے گئی اور اس نے ہمیں نہلایا دھلایا۔ واپس آکر اس نے سکھ سردار کو اطلاع کی...... "بابا جی! یہ تو ہمیشہ مسلے (مسلمان) ہی رہیں گے۔ یہ کبھی خالصے (سکھ) نہیں بن سکتے۔ کیونکہ ان کی نشانیاں (ختنہ) ہوئی ہیں۔ یہ سنتے ہی اس نیک دل سکھ کے اندر کا ظالم انسان جاگ گیا۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما گیا اس نے جو چاہا تھا وہ نہ ہوا، لہٰذا غصے سے پاگل سا ہو کر اس نے حکم دیا۔ "اوئے! انہیں باہر لے جاؤ اور کاٹ ڈالو!" یہ حکم پاتے ہی اس کے دو ملازموں نے ہمیں گردن سے پکڑا تھا باہر کا رخ کیا۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہمیں قتل کرنے کے لئے باہر لے جایا جا رہا ہے تو ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ بڑی بی کو جیسے ہی خبر ہوئی وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اٹھیں اور سر کے بال نوچتے اور اپنے کپڑے پھاڑتے ہوئے سکھ سردار کے قدموں سے لپٹ گئیں اور انہوں نے دہائی دینا شروع کی۔ "سردار جی تمہیں تمہارے گرو کا واسطہ ان بچوں کو چھوڑ دو۔ یہ میری زندگی ہیں۔ میری زندگی چھین کے تمہیں کیا ملے گا۔ میں غریب

ان کے بغیر کیسے جیوں گی۔ میرا وقت نہیں گزرے گا۔ سردار جی انہیں چھوڑ دو یا پھر مجھے بھی ان ہی کے ساتھ کاٹ ڈالو۔"

یہ بڑی بی جنہوں نے ہم سے ڈرامہ کیا تھا اور خواہ مخواہ ہماری ماں بن بیٹھی تھیں اس وقت ڈرامے میں سچائی کا ایسا رنگ بھر رہی تھیں کہ سب لوگ واقعتاً انہیں ہماری ماں ہی سمجھ رہے تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ امی جان بھی اگر اس وقت ہوتیں تو ان کی وہی حالت ہوتی جو اس وقت ان بڑی بی کی تھی۔ انہوں نے سچ مچ ماں کا کردار ادا کیا اور سکھ سردار کو ان کی فریاد پر رحم آ ہی گیا۔ سکھ سردار نے بڑی دکھ بھری آواز میں کہا..... "اوئے چھوڑ دو ان کو اس بیچاری کی زندگی خراب ہو جائے گی!" بڑی بی سردار کے قدموں سے اٹھیں اور انہوں نے ہم دونوں کو اپنی گود میں دبوچ لیا اور کافی دیر ہمیں اپنی گود میں سمیٹے بیٹھی رہیں۔

دوپہر تک سکھ سردار کا غصہ اور غم ختم ہو چکا تھا۔ ہم چاروں بچے اور بڑی بی زخمی نہیں تھے۔ پوری طرح سفر کے قابل تھے لہٰذا اس نے اپنے کارندوں کو ہدایت کی کہ ہمیں اور بڑی بی کو اسٹیشن پر چھوڑ آئیں۔ چنانچہ دو گھوڑوں پر ہمیں اس طرح سوار کیا گیا کہ ایک گھوڑے پر میں اور معین تھے اور دوسرے گھوڑے پر بڑی بی اور دونوں چھوٹے بچے تھے۔ دو سکھ گھوڑوں کی لگامیں پکڑ کر ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ اسٹیشن دور نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے سے بہت پہلے ہم اسٹیشن کے قریب پہنچ گئے۔ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھوڑے سے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔

اچانک گولی چلی اور پھر بہت تیزی سے منظر بدلتا چلا گیا۔ لگامیں پکڑ کر چلنے والے سکھ زمین پر گر کر خون میں لت پت تڑپنے لگے۔ ابھی یہ منظر بھی پوری طرح آنکھوں میں نہیں سمایا تھا کہ گھوڑے بدحواس ہو کر بدکے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھوڑوں پر سوار ہم بچے اور بڑی بی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گرے۔ مجھے چکر سا آیا اور پھر کچھ صاف دکھائی نہ دیا کہ کیا ہوا۔

ہوش آیا تو ہم سب لوگ اسٹیشن پر تھے۔ گرنے سے جو چوٹیں آئی تھیں ان کے لئے ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ کسی کو بھی زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ اسٹیشن پر فوج کا پہرہ تھا اور اسٹیشن پر کسی نے دور سے ہم لوگوں کو پہچان کر فوجیوں کو یہ اطلاع دی تھی کہ دو سکھ ایک مسلمان عورت اور بچوں کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ چنانچہ فوجیوں نے گولی چلا دی۔ بے چارے ہمیں اسٹیشن تک پہنچانے والے نیک دل سکھ مارے گئے۔

کچھ دیر بعد ہمیں گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ ڈبے میں لوگ بری طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ اندھیرا ہونے کے بعد گاڑی رینگ رینگ کر چلنا شروع ہوئی۔ گاڑی کی رفتار بے حد کم غالباً اس لئے تھی

کہ ڈبوں کی چھتوں پر بھی مسافر سوار تھے۔ کبھی کبھی گاڑی بغیر اسٹیشن کے جنگل میں بھی رک جاتی تھی۔ اچانک گاڑی کے رکنے سے طرح طرح کی باتیں ہونے لگتیں۔ کوئی کہتا "سکھوں نے گاڑی رکوا دی ہے اب حملہ ہوگا" کوئی خیال ظاہر کرتا "پٹری پر بم رکھ دیا ہوگا" ایسی باتوں سے مسافر خوفزدہ ہو کر کھڑکیاں بند کر لیتے تھے۔ ڈبے میں اندھیرے اور حبس سے بچے رونے لگتے۔ پیاس الگ ستاتی تھی۔ اس سفر میں بڑی بی مسلسل ہم سب بچوں کی خاطر داری کر رہی تھیں۔ ایک جگہ گاڑی رکی تو بہت شور ہوا۔ لوگ گاڑی سے اتر گئے کئی گھنٹے گاڑی رکی رہی۔ معلوم ہوا کہ گاڑی کی چھت پر کنارے پر بیٹھے ہوئے دو مسافر دو ڈبوں کے درمیان پٹری پر گر کر چلتی گاڑی سے کٹ گئے۔ انہیں وہیں دفنایا گیا۔ اس لئے گاڑی کو اتنی دیر رکنا پڑا۔

پھر دن چڑھے گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رکی۔ اسٹیشن پر راشن کی تقسیم ہو رہی تھی۔ لوگ گاڑی سے اتر گئے۔ کسی کو تو پکا پکایا کھانا ملا اور کسی کے حصے میں محض کچا راشن آیا۔ عورتوں نے پلیٹ فارم کی اینٹیں اکھاڑ کر چولہے بنائے اور ناکافی برتنوں اور سازو سامان کے ساتھ طرح طرح سے کھانا پکنا شروع ہوا۔ بڑی بی ہم بچوں کو ایک طرف بٹھا کر گئیں اور کچھ دیر بعد لوٹیں تو ہم سب بچوں کو آدھی آدھی باجرے کی روٹی اور گڑ لا کر دیا۔ پلیٹ فارم کے نلکے سے پانی پیا۔ اچانک پلیٹ فارم پر ہمیں اپنے ہم جماعت امین اللہ نظر آئے جو ہم سے قافلے میں سلطان چچا اور چچی کے ساتھ علیحدہ ہو گئے تھے وہ بھی اپنے والدین سے علیحدہ ہو گئے تھے اور انہیں کچھ پتہ نہیں تھا۔ کہ چچا اور چچی کہاں ہیں۔ وہاں اور بھی لوگ جاننے والے نظر آئے۔ کچھ لوگوں سے معلوم ہوا کہ ہمارے والدین شہید کر دیئے گئے۔ ہمیں لفظ شہید کے معنی ہی معلوم نہیں تھے اسی لئے ہمیں اس اطلاع پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

لوگ کسی قدر بے فکری سے اور کچھ اپنے بچھڑوں کی تلاش میں اسٹیشن پر گھوم رہے تھے۔ ہم نے بھی بڑی بی سے امین اللہ کے ساتھ گھومنے کی اجازت لے لی۔ امین اللہ سلطان چچا کے ساتھ گاڑیوں میں اکثر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان کے والد ریلوے میں گارڈ تھے اس لئے انہیں گاڑیوں کے بارے میں ہم سے زیادہ معلومات تھیں۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ گاڑی میں کچھ نئی بوگیوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ دراصل جس اسٹیشن سے اور جہاں سے کوئی خالی ڈبہ ملتا تھا تو گاڑی میں جوڑ دیا جاتا تھا تاکہ مسافروں کی زیادہ سے زیادہ بھیڑ کو چھتوں سے ڈبوں کے اندر لایا جا سکے۔ پلیٹ فارم پر پوری خالی گاڑی تھی اور مسافر اسٹیشن پر اترے ہوئے تھے۔ امین اللہ نے گاڑی میں فرسٹ کلاس کا خالی ڈبہ جڑتے دیکھا تو ہم سے کہا آؤ اس میں بیٹھ جائیں، ہم بڑی بی سے اجازت لینے گئے تو انہوں نے آسانی سے اجازت دے دی۔ اب وہ ہماری طرف سے بے فکر نظر آتی تھیں۔

ہم بڑی بی سے اجازت لے کر امین اللہ کے ساتھ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ ڈبہ بالکل خالی تھا۔ امین اللہ نے جلدی سے دروازے بند کئے اور چٹخنی چڑھا دی اور ہم اطمینان سے گدے دار نشستوں پر دراز ہو گئے۔ گاڑی چلنے کے آثار ہوئے اور گاڑی میں روشنی کے ساتھ چھت کے پنکھے چلنے لگے تو امین اللہ نے کھڑکیاں بند کر ڈالیں۔ باہر سے لوگوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر امین اللہ نے دروازہ نہ کھولا۔ بالآخر گاڑی چل دی۔ ہم تینوں فرسٹ کلاس کے مختصر سے ڈبے میں تنہا سفر کر رہے تھے اور نہ جانے کب سو گئے۔ رات میں معین کے رونے سے آنکھ کھلی اور کروٹ لی تو دھم سے گاڑی کے فرش پر گرا۔ ڈبے میں اندھیرا تھا اور بے حد گرمی بھی۔ معین بھی دراصل کروٹ لے کر ہی فرش پر گر کر رو رہا تھا۔ امین اللہ نے کھڑکیاں کھولیں تو چاند کی روشنی اور ہوا کے تازہ جھونکوں سے ہم لوگوں کے حواس درست ہوئے۔ تھوڑی دیر میں پھر سو گئے اور نہ جانے کب تک سوتے رہے۔

جب آنکھ کھلی تو گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ اور چہل پہل خوب تھی۔ ہم کھڑکی سے بیٹھے یہ منظر دیکھتے رہے۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ گاڑی کہاں رکی ہے۔ یہ گاڑی کہاں جائے گی اور ہمیں کہاں جانا ہے۔ بڑی بی کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی والا بوڑھا شخص ڈبے کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور ہمیں غور سے دیکھنے لگا۔ ہمارے لئے اس کا چہرہ اجنبی تھا۔ وہ ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تم حافظ صاحب کے لڑکے ہو؟" (میرے ابا جان حافظ قرآن ہیں) بوڑھے نے پوچھا۔ "جی ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "حافظ صاحب کہاں ہیں؟" "جی وہ تو شہید کر دیئے گئے" میں نے کسی سے سنا ہوا وہ جملہ دہرایا جس کا مطلب مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بوڑھا میری بات سنتے ہی رونے لگا۔ پھر اس نے پوچھا "تمہاری ماں کہاں ہیں؟" "جی وہ بھی شہید ہو گئیں" میں نے وہی معلومات دہرا دیں جو مجھے ملی تھیں۔

بوڑھا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا "تم نے کچھ کھایا ہے؟" میں ابھی تم لوگوں کے کھانے کے لئے کچھ لے کر آتا ہوں" یہ کہہ کر بوڑھا ایک طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مٹی کی سکوریوں میں آلو گوشت اور کاغذ میں لپٹی ہوئی چار پتلی چپاتیاں لے آیا اور ہم سے کہا کہ نیچے آجاؤ۔ ہم نے امین اللہ کو بھی نیچے آنے کو کہا تو بوڑھا بولا "نہیں میں صرف تم دونوں کے لئے لایا ہوں" یہ بے مروتی تھی یا مجبوری۔ ہمیں بہت برا لگا۔ مگر امین اللہ نے ہمیں اصرار کر کے نیچے اتر کر کھانے پر آمادہ کیا۔

ہم پلیٹ فارم پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ بوڑھا ہم سے پنجابی میں باتیں کرتے ہوئے ہمارے حالات کی تفصیل سن رہا تھا۔ اس اثناء میں صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے دو چار

معزز شہریوں کی ایک ٹولی ہمارے اطراف آکھڑی ہوئی اور ہماری باتیں غور سے سننے لگی۔ ہمیں اردو اور بوڑھے کو پنجابی میں باتیں کرتے ہوئے سن کر ایک بزرگ نے بوڑھے سے پوچھا "بابا یہ بچے کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟" جی میرے ہی سمجھ لیں "نہیں یہ تمہارے بچے تو نہیں ہیں تمہاری اور ان کی بولی الگ ہے۔ "جی ہاں۔ دراصل یہ میرے مرشد کے بچے ہیں وہ شہید ہو گئے ان کی ماں بھی شہید ہو گئیں۔ اس لئے ... کوئی وارث نہ ملے یہ بچے میرے ہی ہیں۔

اس کے بعد ان اجلے کپڑوں والے لوگوں نے ہم سے ہمارے سارے حالات سنے اور پھر بوڑھے سے کہا "بابا! ان بچوں کو ہمیں دے دو۔ ان بچوں کو شاید یہ پتہ نہیں کہ شہید ہونا کسے کہتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے والدین سلامت ہوں۔ ہم انہیں ان کے والدین تک پہنچانے کا انتظام کریں گے۔" بوڑھا اس پر رضامند نہیں تھا۔ بزرگ صورت صاحب نے سمجھایا دیکھو بابا ہمیں بچوں کا لالچ نہیں اللہ نے ہمیں بچے دیئے ہیں۔ مگر ہم یہ بات تم سے اس لئے کہہ رہے ہیں، کہ یہ بچے کسی پڑھے لکھے گھر کے ہیں۔ تم انہیں نہ تو ان کے والدین تک پہنچانے کی وہی کوشش کر سکو گے جیسی ہم کریں گے اور اگر ان کے والدین نہ بھی ملے تو تم ان کی پرورش تو کر لو گے مگر ان کی مناسب تعلیم کا بندوست نہیں کر سکو گے۔ ہم انہیں پڑھائیں لکھائیں گے۔ ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ یہ بچے پڑھ لکھ کر کھانے کمانے کے لائق ہو جائیں گے تو تم انہیں ہم سے لے جانا۔ چاہو تو کل ہمارے ساتھ عدالت میں جا کر یہی باتیں اسٹامپ پر لکھوا لو۔"

"نہیں صاحب ایسا نہ کہئے مجھے ان بچوں کی کمائی نہیں کھانی۔ یہ میرے مرشد زادے ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھوں انہیں کوئی تکلیف پہنچی تو میں قیامت کے دن آپ کا گریبان پکڑ لوں گا۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ ان کے لئے مجھ سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اسٹامپ وغیرہ کچھ نہیں لکھوانا۔ آپ انہیں لے جائیے۔ مگر خدا کا واسطہ ہے ان سے اچھا سلوک کیجئے۔ یہ کہہ کر روتے ہوئے بوڑھے نے ہمارے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہمیں ان اجنبی خوش پوش لوگوں کے حوالے کر دیا۔

جہاں ہماری یہ تحویل عمل میں آئی وہ پاکستان کی سرزمین اور لاہور کا اسٹیشن تھا۔ یہ بزرگ صورت انسان انار کلی لاہور کی مشہور جوتوں کی دکان چاؤلہ بوٹ ہاؤس کے مالک شیخ افتخار الدین مرحوم تھے، جو ہمیں اور امین اللہ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے اور ان کے اہل خانہ نے ہم سے بے حساب محبت کا سلوک کیا۔ ہمارے ذہنوں کا خوف دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بالآخر ان ہی کی کوششوں سے ہم ڈیڑھ ماہ بعد اپنے والدین سے مل گئے۔

یہ تھا میرا سفر آزادی یا سفرِ پاکستان جس کے دوران میں نے اپنے نئے وطن پاکستان کو آگ اور خون کے افق سے طلوع ہوتے دیکھا۔

دینِ مساوات

محمد ظہیر الدین

(اسامہ بن زید، مغیرہ، قدامہ، خالد، ولید، عتبہ، سلمہ)

مغیرہ..... آپ نے سنا کیا ہوا؟

سب لوگ..... کیا ہوا ہے؟

مغیرہ..... قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے ہار چوری کیا ہے۔

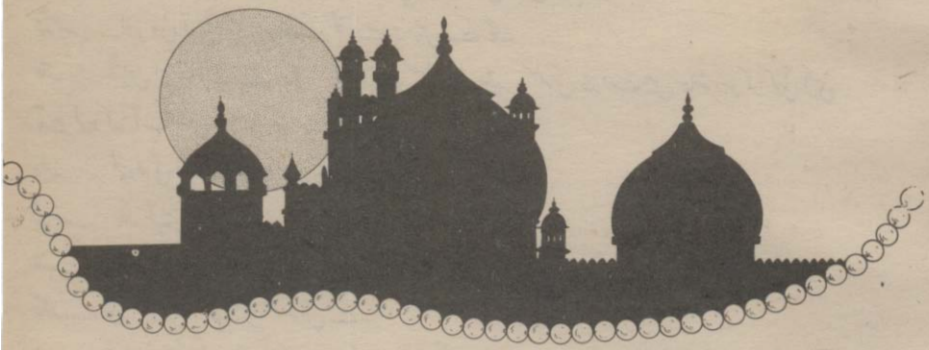

ولید..... کیا کہہ رہے ہو؟ کوئی اور بات کرو۔ مخزومی عورت اور پھر چوری؟

سب لوگ..... ہائے ذلت! مخزومی عورت چوری کر سکتی ہے؟

قدامہ..... بدنامی ہے مخزوم کی اور سارے قریش کی۔

خالد..... کتنی شرم کی بات ہوگی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیں گے۔

عتبہ..... آنحضرتؐ کیا خانوادہ مخزوم کی ایک خاتون کا ہاتھ کاٹیں گے؟!!

سلمہ..... ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ انہیں اس سے کون روک سکتا ہے؟ ایک عورت نے چوری کی۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

قدامہ..... لیکن وہ کوئی عام عورت نہیں۔ وہ تو قریش کی ایک شاخ مخزوم کی عورت ہے۔ عربوں کے ایلہ معزز ترین قبیلہ کی عورت۔

سلمہ..... سب مسلمان، اللہ کی نزدیک برابر ہیں۔ جو کوئی بھی چوری کرے گا اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ قرآن شریف کا حکم ہے۔

ولید..... خواہ وہ شخص مخزوم کا ہی کیوں نہ ہو؟

سلمہ..... جی ہاں! اگرچہ وہ بنو عبدالمطلب کا ہی کیوں نہ ہو؟

عتبہ..... ہائے بدنامی! ہائے ذلت! ہمیں اس رسوائی سے بچاؤ! ایسا نہ ہو کہ کل لوگ باتیں کریں کہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا گیا۔ یہ تو ہمیشہ کے لئے بدنامی ہے۔ جو کوئی بھی اسے دیکھے گا۔ اس کا جرم جان جائے گا۔

قدامہ..... اور ہر دیکھنے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ مخزوم کی عورت ہے۔

خالد..... اور اس کے بعد کوئی مخزومی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔

قدامہ..... اور کوئی قریشی بھی سر اٹھا کر فخر سے نہ چل سکے گا۔

عتبہ..... ہمیں اس ذلت سے بچاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کوئی ایسی تدبیر کرو کہ آپؐ اس عورت کو معاف کر دیں۔

ولید..... مخزوم کی شرافت اور عزت کی خاطر۔

قدامہ..... بلکہ قریش کی نیک نامی کے لئے۔

عتبہ..... قریش تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ہی خاندان کے لوگ ہیں۔

خالد..... اور مخزوم تو آپؐ کی سسرال ہے۔

ولید..... آنحضورؐ کو کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے گھر والوں، اپنے سسرال والوں کو اس رسوائی سے بچالیں۔

سلمہ..... ذلت اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ محمدؐ اس عورت کو معاف کر دیں۔ محض اس لئے کہ وہ ان کے اپنے خاندان کی ہے۔ سب مسلمان اللہ کے حضور برابر ہیں۔ ہر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا خواہ وہ محمدؐ کی برادری اور خاندان سے ہی کیوں نہ ہو تعلق رکھتا ہو۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔

مغیرہ..... تم خاموش رہو۔ کیا تم اپنے گھر والوں کی بدنامی چاہو گے؟

سلمہ..... ٹھیک ہے بھئی۔ میں چپ ہو جاتا ہوں۔

عتبہ..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچو، کوئی ایسا طریقہ نکالو کہ وہ اپنی برادری اور قبیلہ کو رسوائی

سے بچالیں۔

خلد...... اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سے نیکی اور بھلائی کریں۔

مغیرہ...... محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ بہت ہی نیک ہیں۔

سلمہ...... اللہ کی قسم! محمدؐ کبھی اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حد کو ختم کر دیں اور یوں اپنے خاندان والوں سے حسن سلوک کریں۔

مغیرہ...... میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ چپ ہو جاؤ۔

سلمہ...... میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

عتبہ...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ان کے پاس کوئی سفارش لے جائیں تو وہ راضی ہو جائیں گے۔

قدامہ...... ہم آپؐ کی خدمت میں ایک آدمی روانہ کرتے ہیں، وہ آپ سے معافی اور درگزر کی درخواست کرے گا۔

خلد...... اور آپؐ سے جاکر عرض کرے گا کہ ہاتھ کاٹنے میں آپ کے خاندان کی بے عزتی ہے۔

مغیرہ...... حضرت محمدؐ اپنے گھر والوں کو کبھی بدنام نہ ہونے دیں گے۔

خلد...... ہم میں سے کون جائے؟ مغیرہ! آپ چلے جائیے۔

مغیرہ...... مجھے تو اس سے معاف رکھو! خلد، آپ خود کیوں نہیں چلے جاتے!

خلد...... مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔

مغیرہ...... پھر عتبہ چلا جائے۔

عتبہ...... مجھے تو اس پیغام کے لے جانے سے معاف ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔

مغیرہ...... قدامہ چلا جائے۔

قدامہ...... نہیں! میں نہیں جاؤں گا۔

مغیرہ...... اچھا تو پھر ولید کو جانا چاہئے۔

ولید...... نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ بہتر یہ ہے کہ اُسامہ چلا جائے۔

سب مل کر...... بہت خوب! بہت خوب! اسامہ ہی کو جانا چاہئے۔

اسامہ...... بھئی! اسامہ ہی آخر کیوں جائے؟ تم میں سے کوئی کیوں نہیں جاتا۔؟

مغیرہ...... آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کی بڑی شفقت ہے تم پر۔

قدامہ ...... تمہیں تو وہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے ہیں۔
مغیرہ ...... مہربانی کیجئے! ہمیں رسوائی سے بچائیے۔
سب ...... ہم سب آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ اور آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھولیں گے۔
مغیرہ ...... اُسامہ! آپ چلے جائیے! آپ ہی مناسب ہیں۔

دوسرا منظر

اسامہ، حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس آتے ہیں تو سب لوگ کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ پھر سب بیٹھ جاتے ہیں۔

مغیرہ ...... اسامہ! آپ گئے تھے نا؟
اسامہ ...... میں گیا تھا۔
خلد ...... تم نے بات کی تھی؟
اسامہ ...... جی۔ میں نے بات کی تھی۔
عتبہ ...... آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہاری بات غور سے سنی تھی؟
اسامہ ...... جی ہاں!
ولید ...... تم نے کہا تھا کہ ہاتھ کاٹنے میں ان کے اپنے خاندان کی رسوائی ہے۔
اسامہ ...... میں نے عرض کیا تھا۔
مغیرہ ...... تم نے انہیں بتایا ہو گا کہ یہ ہمیشہ کی بدنامی ہو گی۔
اسامہ ...... میں نے آپؐ کی خدمت میں یہ بات بھی عرض کی تھی؟
مغیرہ واہ بھئی واہ! تم نے بہت بڑا کام کر دیا ہے۔ اچھا تو پھر آپؐ نے مخزوم کی بیٹی کو معاف فرما دیا ہے؟
اسامہ ...... آپؐ نے خاندان مخزوم کی عورت کو معاف نہیں فرمایا۔
عتبہ ...... انہوں نے یہ کہا ہو گا کہ اللہ کے حکم نافذ کرنے اور حد جاری کرنے میں سب مسلمان برابر ہیں۔
خلد ...... خواہ مجرم، مخزوم ہی کا کیوں نہ ہو؟
اسامہ ...... میں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ چوری کرنے والی عورت کا تعلق مخزوم سے ہے۔

ہاتھ کاٹنے میں پورے قبیلہ مخزوم اور قریش کی بدنامی ہے۔ آپ در گزر فرمادیں۔ یہ سن کر آپ ؐ نے کہا......

خلد...... کیا فرمایا تھا؟

اسامہ...... میری یہ درخواست سنتے ہی حضورؐ کے چہرۂ انور پر غصہ کے آثار ظاہر ہوئے۔ آپ ؐ نے مجھے ڈانٹ کر فرمایا۔ اسامہ! کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرنے آئے ہو؟ یہ کہہ کر آپ ؐ کھڑے ہوگئے اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"دیکھو! تم سے پہلے لوگ اس لئے تباہ ہوئے تھے کہ جب ان میں کوئی معزز شہری چوری کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اسے سزا دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر میری بیٹی فاطمہ ؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔"

سلمہ...... رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ اللہ کے ہاں سب برابر ہیں۔ ہمارا دین مساوات اور برابری کا دین ہے۔ آپ ؐ پر لاکھوں سلام ہوں۔

[illegible]...... آپ ؐ پر اللہ کی رحمت اور سلامتی نازل ہو۔

(عربی سے ترجمہ)

ایک باپ اپنے بچے کو سمجھا رہا تھا کہ "بیٹا اگر کوئی بڑا آجائے تو خود اٹھ کر ان کو جگہ دیتے ہیں۔"

ایک دن بچہ گود میں بیٹھا تھا کہ دادا جان آگئے۔ بچہ بولا

"آئیے دادا جان، تشریف رکھئے۔"

"پچھلے سال میں نے جواہرات کی ایک دوکان کھولی تھی۔"

ایک دوست نے دوسرے کو بتایا۔

"اوہ! بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ تم نے خوب کمایا ہوگا۔"

"نہیں" اس شخص نے جواب دیا۔ "دوکان کا دروازہ کھولتے ہی پولیس نے مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا تھا۔"

پروین کنول...... خانیوال

جہانِ نو

محمد صالح ارشاد

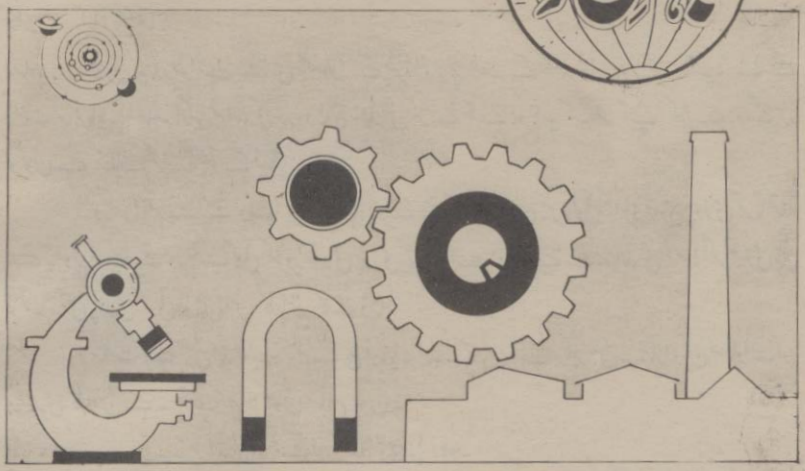

جاسوس طیارہ:۔

دوران جنگ دشمن کے ٹھکانوں کے بارے میں معلومات نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ F—16 کے نیچے لگے ہوئے ڈیجیٹل ویڈیو ریکارڈنگ کی مدد سے دشمن کے ٹھکانوں کی تصاویر کھینچ کر انہیں زمینی اسٹیشن کو بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ وہاں موجود افراد ان کا جائزہ لے کر حملہ کے بارے میں ہدایت دے سکیں

اوپر تلے:۔

جگہ کی قلت اور گاڑیوں کی فراوانی کی وجہ سے مغربی ممالک میں گاڑی پارک کرنا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔

لیکن مغربی ممالک میں مسائل انسانوں کا زیادہ دیر مقابلہ نہیں کر پاتے ہیں اور بالآخر جیت انسان ہی کی ہوتی ہے۔ ایک گاڑی کی جگہ پر چار گاڑیاں ایک دوسرے پر رکھنا پارکنگ کے مسئلہ کو حل کرنے کا ایک بہترین اور انوکھا طریقہ ہے۔

چلتا پھرتا ٹی وی:۔

ٹی وی کو بولتے ہوئے تو آپ روزانہ ہی دیکھتے ہیں، لیکن اس کو پیروں پر چلتے ہوئے شائد آپ نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ سونی کمپنی کی جانب سے منعقد کئے جانے والے سائنسی میلے میں برائن ایلیٹ-BRAINEL LIOT نام کے ایک طالب علم نے اس خوبصورت چلتے پھرتے ٹی وی کا خیال پیش کر کے اول انعام حاصل کیا۔

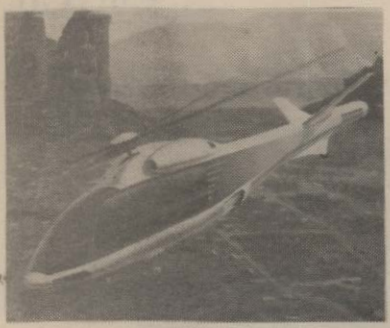

مستقبل کے ہیلی کاپٹر:۔

ہیلی کاپٹر کے دم پر موجود پنکھا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا کہ گاڑیوں میں ٹائر۔ لیکن مستقبل قریب میں آنے والے ہیلی کاپٹروں کی دُم پر کوئی پنکھا نہیں ہوگا اور یوں ہیلی کاپٹر صرف درمیان میں موجود پنکھے کی مدد سے اڑے گا۔ ایسے ہیلی کاپٹر کو NOTAR یعنی No TAIL ROTOR کہتے ہیں۔

ناول لائٹ:۔

اب آپ کمرے میں موجود دوسرے افراد کی نیند میں خلل ڈالے بغیر بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹی سی ناول لائٹ صرف آپ کی کتاب پر روشنی ڈالتی ہے اور یوں دوسرے لوگ روشنی سے متاثر نہیں ہوتے ہیں۔

خود کار سیڑھی:۔

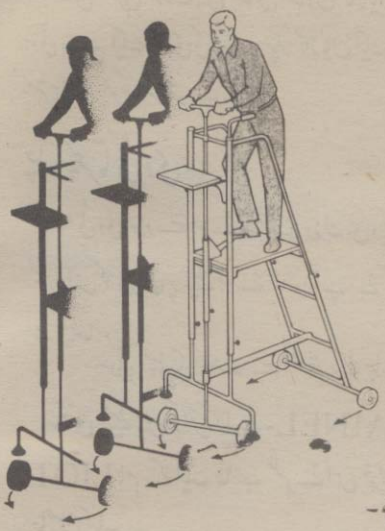

دیواریں صاف کرنے کے دوران بار بار چڑھنا اور اترنا ایک تکلیف دہ کام ہوتا ہے۔ اس مسئلے کو سوئٹزر لینڈ کی ایک کمپنی نے ایک خود کار زینہ تیار کر کے حل کیا ہے۔

اس سیڑھی کو بغیر نیچے اترے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ سیڑھی کو آگے بڑھانے کیلئے، اگلے پہیوں کے برابر لگے ہوئے اسٹینڈ کو اوپر اٹھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہینڈل کو ہاتھوں کی مدد سے آگے پیچھے کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں سیڑھی آگے بڑھنی شروع ہوجاتی ہے۔

دور کی آوازیں:۔

آپ دوربین کی مدد سے دور کی چیزوں کو صاف اور واضح طور پر تو اکثر دیکھتے ہوں گے۔ جاپان کی ایک

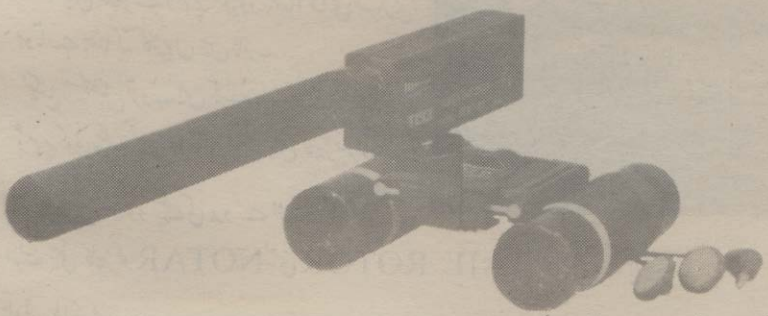

کمپنی نے ایک دوربین ایسی بنائی ہے۔

جس سے نہ صرف دور کی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں بلکہ دور کی آوازیں بھی بخوبی سنائی دیتی ہیں۔ دوربین میں لگا ہوا، حساس مائیکروفون آپ سے کافی دور ہونے والی گفتگو کو نہایت آسانی سے کیچ کر کے کانوں سے منسلک ہیڈ فون تک منتقل کر دیتا ہے۔

خستہ کرارا ۔ نیا چٹخارہ
فریش ویل
بیسٹ نمکین
Freshwel
Best Namkeen
NET WT 200 GMS
بیسٹ نمکین کی مکمل ورائٹی کراچی میں
فریش ویل کے تمام سیلز پوائنٹس پر دستیاب ہے
کراچی سے باہر رہنے والے اپنے دوست احباب سے فرمائش کریں

سیکھیے بچّوں سے آکر کچھ جناب
اس طرح ہوتا ہے دیکھیں انتخاب

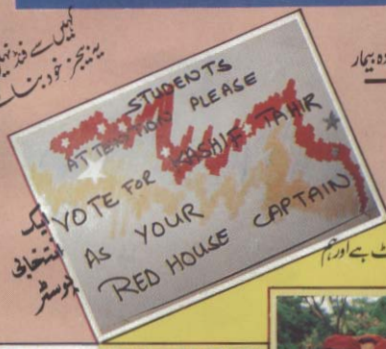

کہیں سے فنڈ نہیں آئے
یہ بینرز خود بنائے ہیں

ایک انتخابی پوسٹر

چار انار چودہ بیمار →

جیتیں گے یا ہاریں گے
مجھ کو سبھی سنواریں گے

بے چارے امیدوار

امانت ووٹ ہے اور ہم

خدارا ووٹ دے کر تمہاری لاج رکھ لینا

(کاؤنٹنگ)

امانت دار ہیں دیکھو

گنتی کے مرحلے کا بھی منظر عجیب ہے

(کنوینسنگ)

کیسی بے قراری ہے
جیتا کون ہے ہارا کون ؟

پولنگ کا منظر →

نتیجے کا انتظار ←

اب کے کس کی باری ہے
سب کی رائے شماری ہے

جیت اور ہار کا ایک دن

بچوں کے دلچسپ الیکشن کا احوال

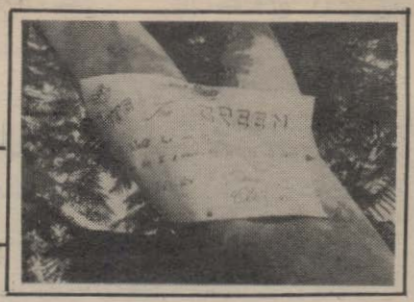

سلیم مغل

جن، بھوت، اور چڑیل کے بعد ہمیں جس چیز سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے وہ ہے "الیکشن"۔ آپ حیران تو ہو رہے ہوں گے کہ اس میں بھلا خوف زدہ ہونے والی کیا بات ہے؟ تو لیجئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

یہ بات تو آپ تسلیم کریں گے کہ ہمارے ہاں کسی بھی نوعیت کے الیکشن ہو رہے ہوں، اس میں ہنگامہ ضرور ہوتا ہے۔ لڑائی جھگڑا، پتھراؤ، مار پیٹ، دھونس دھمکی یہاں تک کہ اغواء اور قتل جیسے سنگین واقعات بھی ہمارے ہاں الیکشن کے موقعہ پر ہو ہی جاتے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جس الیکشن میں یہ سب کچھ ہوتا ہو اس کے ذکر سے آخر خوف نہ آئے گا تو اور کیا آئے گا۔؟ اور پھر ہم تو ایسے بد قسمت واقع ہوئے ہیں کہ ہمیں ہر الیکشن کے بعد کوئی نہ کوئی بڑا دکھ ضرور اٹھانا پڑا یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کے قومی انتخابات کے ساتھ ہی پورے ملک میں انتشار شروع ہو گیا۔ اس انتشار کے نتیجے میں ہمارا پیارا ملک دو ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔

ہم ایک الیکشن کے صدمے سے ابھی نہیں نکل پاتے کہ ایک اور الیکشن ہمارا امتحان لینے آجاتا ہے۔ ابھی چند روز پہلے صدر مملکت نے اعلان کیا کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو پاکستان کے قومی انتخابات ہوں گے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہماری تشویش کا گراف اوپر کی طرف جانا شروع ہو گیا۔ ہم دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے "خدایا خیر ہو۔ اس بار الیکشن پر امن ہو جائیں اور کہیں کوئی جھگڑا نہ ہو" ابھی ہم یہ دعا مانگ ہی رہے تھے کہ کسی نے ہمارے کان میں آہستہ سے کہہ دیا "۲۹ اگست کو الیکشن ہو رہے ہیں اور آپ کو خبر تک نہیں۔"

ہم نے کلینڈر کو دیکھا تو اگست کو ۲۷ ویں دن پہ کھڑا پایا..... گویا دو دن بعد الیکشن تھے..... مگر الیکشن تو ۲۴ اکتوبر کو ہونے والے تھے..... پھر یہ ۲۹ اگست کہاں سے آٹپکی۔؟ ہم نے حیران بلکہ پریشان

ہوتے ہوئے پوچھا۔ پوچھنے پر پتہ یہ چلا کہ یہ الیکشن تو بچوں کے ہیں..... "بچوں کے الیکشن" کی خبر ہمیں بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ اس لئے بھی کہ ہم نے اس سے پہلے کبھی بچوں کے الیکشن نہیں دیکھے تھے اور اس لئے بھی کہ ہم بچوں اور بڑوں کے الیکشن کے فرق کو دیکھنا چاہتے تھے۔

ہم نے اسکول کی پرنسپل مسز معروف سے انتخابی مہم میں شریک ہونے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے کچھ دیر گفتگو کے ذریعے ہمیں ہمارے اندر سے ٹٹولا اور پھر ہمیں کسی قابل سمجھتے ہوئے بڑی محبت کے ساتھ اجازت دے دی۔ پھر سینئر کیمبرج کی انچارج مسز محمود سے ملاقات کے بعد ۲۸ اگست کی صبح ہم اپنے کیمرے کے ساتھ بچوں کے انتخابی حلقے (کراچی پبلک اسکول) میں موجود تھے۔

اس حلقے میں انتخابی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ بعض امیدواروں کے چہروں سے ایسی معصومیت اور مظلومیت ٹپک رہی تھی کہ خود ہمارا جی یہ چاہنے لگا کہ ہمارے بس میں ہو تو ہم جعلی ووٹ دے کر بھی ان بیچاروں کو جتوا ہی دیں۔ ہر طرف رنگ برنگے خوب صورت پوسٹرز آویزاں تھے جنہیں بچوں نے خود تیار کیا تھا۔ کئی بچوں نے اپنے سینوں پر امیدواروں کے ناموں کے بیجز لگا رکھے تھے..... بچوں کے شوق کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک امیدوار کی آواز ہمارے کانوں نے بھی سنی جو ووٹ طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تو تو میرا پیارا بھائی ہے نا.....؟" ..... "ہاں ہاں الیکشن تک تو ہوں۔" یہ جواب تھا بے چارے جلے بھنے ووٹر کا۔

انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی کہ اسکول کی مخصوص گھنٹی کی آواز سنائی دی اور اس آواز کے ساتھ ہی ایسا لگا کہ جیسے ہم نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب تھا..... پلک جھپکتے ہی سب بچے اپنی کلاسوں میں تھے۔ ہاف ٹائم ختم ہو چکا تھا..... تب ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ انتخابی مہم تو صرف ہاف ٹائم تک کے لئے محدود تھی..... گویا یہ الیکشن پڑھائی لکھائی کی راہ میں رکاوٹ نہ تھے۔

بچے کلاسوں میں چلے گئے تو ہم چیف الیکشن کمشنر مسز شاہینہ محمود کے پاس جا بیٹھے جو الیکشن کے علاوہ اس اسکول کی انچارج بھی تھیں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ "اس الیکشن کے ذریعہ اسکول کا ایک ہیڈ بوائے اور تین ہاؤس کیپٹن منتخب کئے جائیں گے۔ اس کی وضاحت انہوں نے یوں کی کہ ہیڈ بوائے اسکول کے تمام طلباء کا نمائندہ ہوگا اور ہم اس کے ساتھ مل جل کر بچوں کی شکایات دور کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں گے..... اسی طرح ہمارے اسکول کے بچے تین ہاؤسز میں تقسیم ہیں (۱) ریڈ (۲) بلیو اور (۳) گرین۔ ان تینوں ہاؤسز کے نمائندے بھی منتخب ہوں گے اس کے بعد ۱۶ افراد پر یفیکٹ لئے جائیں گے جن میں ہارنے والے بھی شامل ہوں گے۔ اس طرح یہ ۲۰ رکنی کابینہ مل کر اسکول کو اچھا رکھنے، اس کے معیار تعلیم کو بڑھانے اور یہاں کے مسائل کو حل کرنے میں ہم سے تعاون

جو کینڈی ڈیٹ میرا ہے اُسی کو ووٹ دینا تم

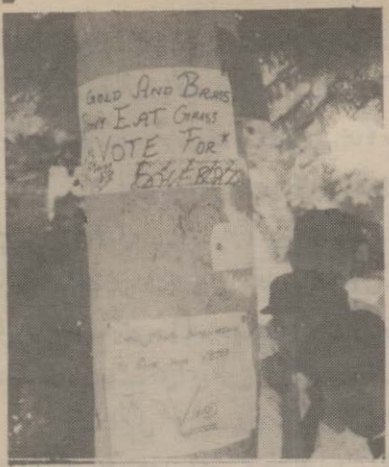

شامل ہوا درخت بھی الیکشن کے کھیل میں

کرے گی۔

۲۹ اگست کو اپنے ۴ نمائندوں کو منتخب کرنے کے لئے پانچ سو سے زائد بچے اور بچیاں اسکول کے میدان میں قطار بنائے ہوئے اور نظم و ضبط کی تصویر بنے ہوئے کھڑے تھے..... ہر بچہ ووٹ ڈالنے کے لئے اپنی باری کا منتظر تھا۔ جس طرح الیکشن کے موقعہ پر پولیس یا فوج کی موجودگی ضروری ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح اس الیکشن میں مس شہلہ ملک کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ ان کی ایک ہی آواز پر بچے اپنی بد نظمی کو نظم و ضبط میں بدل دیتے..... ۴ پولنگ اسٹیشنوں پر بچے باری باری آتے پہلے ان کا نام چیک ہوتا، پھر انگوٹھے پر سیاہی لگتی، پھر انہیں بیلٹ پیپر دیا جاتا۔ وہ اس پر نشان لگاتے اور رنگ برنگے بیلٹ بکس میں ووٹ ڈال کر آگے بڑھ جاتے..... ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر ووٹنگ مکمل ہو گئی۔ ۹۹ فی صد ووٹ ڈالے گئے۔ رائے شماری کے بعد بچے واپس کلاس روم میں چلے گئے اور تمام ٹیچرز نے مل کر ووٹوں کی گنتی شروع کر دی۔

گنتی کے دوران ہم نے محسوس کیا کہ کسی امیدوار کے نام پر کوئی ایک ٹیچر خوش ہوتا تو کسی اور نام پر کوئی دوسرا۔ گویا اس عرصے میں اساتذہ بھی امیدواروں کے لئے اپنی اپنی رائے بنا چکے تھے اور ہر ٹیچر کسی نہ کسی امیدوار کی کامیابی کا خواہاں ضرور تھا..... ووٹوں کی گنتی کے دوران ہم نے ہاف ٹائم کا فائدہ اٹھایا اور باہر آکر بچوں سے گپ شپ شروع کر دی میں نے کلاس تھری بی کے انور مرزا سے پوچھا..... آپ نے ووٹ کسے دیا؟ "کاشف طاہر کو" انور مرزا نے بتایا۔ کاشف طاہر ہی کو کیوں دیا۔؟ میں نے اگلا سوال کیا.....

"میرا مرضی" "میرا نہیں..... میری مرضی ہوتی ہے" میں نے انور کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس پر ایک شرارتی بچے نے لقمہ دیا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے..... "میری مرضی" تو لڑکیوں کی ہوتی ہے لڑکوں کا تو "میرا مرضی" ہوتا ہے۔ شرارتی بچہ یہ کہتے ہی ایسا بھاگا کہ پھر نظر نہ آیا

"او" لیول کے اطہر نے بتایا کہ اس نے کیلاش کو ووٹ دیا ہے اس لئے کہ اس کے مینرز اچھے ہیں۔ کلاس فور کی سمیعہ سلیم کو بھی کاشف بھائی اچھے لگے..... بہت سے بچوں نے اپنی اپنی رائے دی۔ بچوں کی رائے میں جو پہلو حیرت کا تھا وہ یہ کہ انہوں نے ہم بڑوں کی طرح کسی رو میں بہہ کر یا کسی بھیڑ چال کی طرح ووٹ نہیں دیا بلکہ امیدواروں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اچھی طرح جانچا۔ کاش ہمارے سب بڑے بھی اسی طرح سوچ سمجھ کر ووٹ دیا کریں۔

ہاف ٹائم کی گھنٹی ایک بار پھر بجی مگر اس بار اس گھنٹی کا مطلب کلاس میں واپس جانے کے بجائے میدان میں جمع ہونا تھا۔ الیکشن کا نتیجہ سنایا جانے والا تھا ہر بچہ مضطرب اور بے چین تھا..... سب کی نگاہیں مائیک پر تھیں..... بالآخر نتیجہ سنا دیا گیا شیراز احمد ۵۷۰ میں سے ۲۸۰ ووٹ لے کر ہیڈ بوائے بن گئے۔ طاہرہ صدف، ونود ستانی اور صدف گیلانی ہاؤس کیپٹن منتخب ہو گئے..... ان ناموں کے اعلان کے ساتھ ہی ایک لمحے کو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹے اور بچوں نے بے اختیار چیخ کر اور اچھل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ خوشی کا یہ اظہار بتا رہا تھا کہ بچوں کو اپنے نمائندوں سے کتنا پیار ہے اور ان پر کتنا اعتماد۔ خوشی کے مارے جیتنے والوں کی آنکھوں میں بھی موتی چمکنے لگے اس موقع پر ہم نے دو ٹیچرز کو سنجیدہ، دو کو رنجیدہ اور ایک کو تو آنسوؤں کے ساتھ روتے ہوئے بھی دیکھا..... ان کے پسندیدہ امیدوار کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ نتائج کے اعلان کے بعد کامیاب امیدوار باری باری آئے اور اس عزم کا اظہار کرتے رہے کہ وہ اپنے اسکول کو اچھا بنانے اور یہاں کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی کمی روا نہیں رکھیں گے۔

الیکشن ختم ہوئے مگر اس کا خوشگوار تاثر اب بھی باقی ہے..... پوری انتخابی مہم میں کوئی بدمزگی نہیں ہوئی لڑائی جھگڑے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ کوئی غیر اخلاقی بات سننے یا دیکھنے میں نہیں آئی۔ بچوں نے ثابت کر دیا کہ وہ معصوم اور بے ضرر بھی ہیں اور اپنے بڑوں سے بہتر بھی..... اس پورے انتخابی معرکے میں ایسا لگا جیسے بچے اپنے بڑوں کو مخاطب کر کے یہ کہہ رہے ہوں کہ.....

تم کو تو جیت دیکھنا یا ہار دیکھنا
ہم کو مگر لڑائی کا معیار دیکھنا

نتائج کے بعد اسکول کی لائبریری میں ہماری ملاقات کامیاب امیدواروں سے ہوئی۔ چاروں امیدوار

سیاہی کیوں لگاتی ہیں؟ بھروسہ کیوں نہیں کرتیں!؟

میرا ووٹ میرے ضمیر کی امانت ہے...

اس بات پر متفق تھے کہ طالب علموں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے اور تعلیم پر پوری توجہ دینی چاہئے...... اس لئے کہ یہی سیاست فساد کی جڑ ہے۔

ان نمائندوں کو کچھ شکوے اسکول سے بھی تھے ان کا خیال تھا کہ اسکول کی فیس اچھی خاصی ہے مگر کھیلوں کی سہولت بہت کم ہے۔ برش اور رنگ اسکول کی طرف سے ملنے چاہئیں وہ نہیں ملتے۔

اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ ان کی کوشش ہوگی کہ بچے وقت پر اسکول آئیں۔ پڑھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں کینٹین میں کھانے کی چیزیں اچھی اور مناسب قیمت پر ملیں کھیلوں کے لئے زیادہ وقت ملے۔

ہیڈ بوائے منتخب ہونے والے شیراز سے جب میں نے پوچھا کہ چھٹیوں میں اسکول وین کے پیسے کیوں دیئے جاتے ہیں؟ کیا ان دنوں بھی ان کا پٹرول خرچ ہو رہا ہوتا ہے؟ تو شیراز نے کہا کہ ہاں واقعی یہ تشویش ناک بات ہے ہم اس مسئلے کو بھی اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا آپ لوگ اخبار باقاعدگی سے پڑھتے ہیں جو جواب ملا وہ من حیث القوم ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے اسکول کے کم سن طالب علم کا جواب تھا کہ "ہم اخبار میں کیا پڑھیں؟ اخبار میں قتل و غارتگری کے علاوہ اور پڑھنے کو ہوتا ہی کیا ہے؟"

پھر ان کمسن نمائندوں نے حکمرانوں سے درخواست کی کہ وہ قومی انتخابات میں ووٹ کی خرید و فروخت کا سلسلہ رکوائیں، جعلی ووٹنگ اور غلط کاؤنٹنگ نہ ہونے دیں اور فلور کراسنگ نہ ہو......

ننھے نمائندوں کے منہ سے قومی امور پر تشویش کی باتیں اور ان کی زبان سے فلور کراسنگ جیسی بوجھل سیاسی اصطلاحوں کو سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

میں نے ان بچوں کو ان کی عمروں کے حوالے سے جانچا تو اپنے آپ سے بہت آگے پایا...... خدا کرے یہ یونہی پڑھتے رہیں اور آگے بڑھتے رہیں...... ان کا آگے بڑھنا ہی اندھیروں کے چھٹنے اور جہالت کے پیچھے ہٹنے کی نوید ہے۔

آنکھ مچولی مقابلہ مسکراہٹ

سنا ہے پھول برستے ہیں مسکرانے سے

مسکراہٹ ہمارے چہرے کا حسن بھی ہے اور ہماری باطنی خوشی کا اظہار بھی۔
بچے مسکرائیں تو دلوں کو سرور اور ذہنوں کو آسودگی ملتی ہے۔

کیا آپ کو دعویٰ ہے کہ

آپ، آپ کا بھائی بہن یا کوئی بھی عزیز بچہ مسکراتا ہوا بہت اچھا لگتا ہے۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ

آپ کی خوشگوار مسکراہٹ کی راہ میں گندے دانت، حائل نہیں ہیں

اگر ایسا ہے تو پھر مسکرایئے

مسکراتے ہوئے ایک خوبصورت رنگین تصویر ہمیں بھجوا دیجئے آپ کے موتی دانتوں کے ساتھ۔ آپ کی جگمگاتی مسکراہٹ پر ایک خوبصورت ہنستی مسکراتی **شیلڈ** SMILING SHEILD اور بہت سے تحائف آپ کے منتظر ہیں

شرکت کی آخری تاریخ ۳۰ نومبر ۹۰ء عمر کی حد تین سے ۱۳ سال ہے۔

غیر واضح تصویر مقابلے میں شامل نہ ہو سکے گی۔ تصویر کا پوسٹ کارڈ سائز ہونا ضروری ہے۔

تمام منتخب اور انعام یافتہ تصاویر جنوری ۱۹۹۱ء کے خاص نمبر میں شائع ہوں

سیاستدانوں کے نام خط

بے نظیر بھٹو صاحبہ

آپ سے میری التجا ہے بلکہ تمام پاکستانی بھائی بہنوں کی طرف سے التجا ہے کہ آپ اپنے سبھی بہی خواہوں اور ماننے والوں سے کہئے کہ وہ اپنے دلوں سے نفرت نسلی لسانی اور علاقائی تعصبات بھلا کر محبت کی مشعل روشن کریں۔ اور اپنے اصلی دشمنوں کو پہچانیں جو ہمارے درمیان نفرت اور تعصّب کا بیج بو رہا ہے۔ خدا کے لئے آپ اپنی بہنوں اور ماؤں کے سہاگ بچا لیجئے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو یتیم ہونے سے بچا لیجئے آخر میں میں اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتی ہوں کہ وہ ہماری قوم کے تمام سیاستدانوں کو وسعت قلب و جگر عطا فرمائے کیونکہ نہ ہم سندھی ہیں نہ پنجابی نہ مہاجر اور نہ ہی پٹھان بلکہ ہم سب پاکستانی اور مسلمان ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی۔ بھلا مسلمان بھی آپس میں ایک دوسرے سے نفرت و تعصّب کر سکتے ہیں۔ نہیں بالکل نہیں اسلام نے ہمیں یہ سبق نہیں دیا ہے بلکہ اس نے تو ہمیں محبت اتحاد اور اتفاق کا درس دیا ہے۔

(ایک پاکستانی بیٹی)

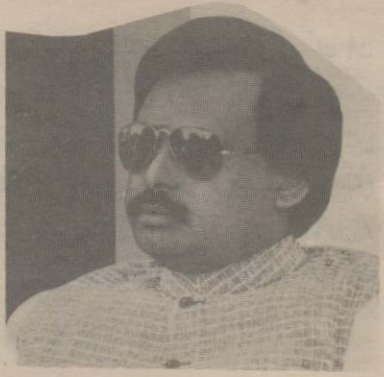

الطاف حسین صاحب سے ایک گزارش

آخر ہنگاموں میں اسکول اور کالج کو کیوں نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اسکول و کالج کے شیشے کھڑکیاں، دروازے، بنچیں وغیرہ کا جو حال ہوتا ہے وہ بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اس معاشرہ میں بے جان چیزوں سے کیوں انتقام لیا جاتا ہے۔ پلیز اس گورکھ دھندے کو بند کروائیں۔

(محمد عاقل احمد خان۔ پرانا سکھر)

وزیر اعلیٰ پنجاب کے نام

اس بار موسم گرما کی تعطیلات شروع ہوتے ہی مجھے اپنے تایا زاد بھائی کی شادی کی تقریب میں لاہور جانا پڑا۔ میں لاہور جاتے وقت بے حد پر جوش اور بے حد مسرور تھی۔ کیونکہ میرے تصورات کے مطابق لاہور ایک بے حد خوبصورت اور تاریخی مقام ہے لاہور اسٹیشن کی شاندار اور وسیع و عریض عمارت نے تو ہمیں بے حد متاثر کیا لیکن ہمیں اسٹیشن اور گرد و نواح میں توڑ پھوڑ، کوڑا کرکٹ اور گندگی کے آثار زیادہ نظر آئے سب کچھ اجڑا ہوا دبار سا لگتا تھا۔ لوگ بھی ست اور میلے کچیلے گرد غبار ہر چیز پر چھایا ہوا۔ ہم نے سوچا شاید تھکان کی وجہ سے ایسا کچھ محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن جب سامان اٹھا کر سٹیشن سے باہر نکلے تو ہر طرف یہی منظر تھا۔ لاہور کی ٹوٹی پھوٹی عمارتوں، کچرے کے ڈھیروں اور سڑکوں پر لید کے آثار نے ہماری حسِ لطیف کو تکلیف پہنچائی۔ جب ہوا چلتی تو ایسا لگتا کہ کوڑے اور لید کی ایک آندھی آگئی ہے محلوں میں گھروں کے سامنے گندی نالیاں بدبو کے بھبکے اڑا رہی تھیں بازاروں کی گلیاں تنگ کیچڑ وغیرہ سے بھری ہوئی تھیں۔ کیونکہ صفائی کا خاطر خواہ انتظام نہیں بس لوگ چھڑکاؤ کرتے رہتے ہیں اپنی دکانوں کے سامنے۔

آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ پرانا لاہور ہے۔ نئے شہر کی آن بان یقیناً بے حد شاندار ہو گی۔ لیکن آخر پرانے شہر کو بھی تو یہ حق حاصل ہے کہ اسے صاف ستھرا رکھا جائے۔ ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے ملبے کو صاف کرایا جائے۔ سڑکیں گرد غبار اور کوڑے کرکٹ اور لید سے چھٹکارا حاصل کریں۔ لوگوں کو سختی کے ساتھ صفائی ستھرائی کا عادی بنایا جائے۔ دکانداروں کو جرمانہ کیا جائے اگر وہ اپنے آس پاس کے ماحول کو صاف ستھرا نہ رکھ سکیں۔ بلدیہ کے ملازمین کو تنبیہ کرنی چاہئے کہ وہ شہر کو صاف ستھرا رکھنے

میں ناکام رہے ہیں۔

میری آپ سے صرف یہ درخواست ہے کہ کم از کم ہمارے شہر ایسے تو ہوں کہ باہر سے آنے والے سیاح ایک خوشگوار تاثر لے کر پاکستان سے جائیں۔

والسلام

(لبنیٰ ظفر۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جناب رسول بخش پلیجو صاحب کے نام

آپ ایک معتبر سیاستدان ہیں۔ ان حالات میں آپکو چاہئے کہ آپ ایسے بیانات دیں جن سے ملک کے حالات بہتر ہونے کے امکانات ہوں۔ اپنی پارٹی کے لیڈروں کو تاکید کریں کہ وہ کوئی ایسا بیان نہ دیں یا کام نہ کریں جن سے ملک میں حالات زیادہ خراب ہوں۔ آپ اپنے ہم عصر سیاستدانوں سے مل کر بات چیت کریں تاکہ حالات بہتر ہونے کی راہ ہموار ہوسکے۔ یہ آپ کا اور سب سیاستدانوں کا فرض ہے۔

ہماری دعا ہے کہ ملک آباد اور خوشحال رہے۔ آمین

(اللہ داد شاد۔ تربت مکران)

وطن عزیز کے محترم سیاستدانو!

ہم بچے کبھی آپس میں لڑتے ہیں تو بڑے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہتے ہیں "اچھے بچے آپس میں لڑتے نہیں، کیوں جانوروں کی طرح لڑتے ہو"؟ آپ سے ہمارا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی مگر سچ تو یہ ہے کہ آنکھ مچولی کی اجازت پر ہم کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔

ہماری باتیں یا گزارشات نئی نہیں ہیں وہی ہیں جو ہم آپ سے یا اپنے اور بڑوں سے سنتے آئے ہیں سب سے پہلے تو یہ کہ برائے کرم آپ حضرات (سیاستدان) آپس میں ایک دوسرے کی ذات کو سیاست کا نشانہ مت بنایا کریں۔ سیاسی اختلاف تو جمہوری حق ہے، وہ ہونا چاہئے لیکن اگر آپ ذاتیات میں جائے بغیر اپنا کام کریں۔ اپنے منشور کی تشہیر کریں۔ اپنے طریقہ کار سے عوام کو روشناس کرائیں تو ہمارا ملک صحیح معنوں میں جمہوری ملک بن جائے گا۔ عوام کو بھی یہ معلوم ہو گا کہ کون سی جماعت حکومت میں آکر ان کے مسائل کو کس طرح حل کرنا چاہتی ہے۔ آج کے دور میں ہمارے لئے روزی، روٹی اور تعلیم کے مقابلے میں امن کا مسئلہ بہت اہم ہے، آپ بتائیں..... کہ وطن عزیز سے صوبائی عصبیت، لسانی اور گروہی عناد کو کس طرح دور کریں گے، کیوں کہ جب امن ہو گا تب ہی روٹی، روزی اور تعلیم بھی ہوگی۔ امن کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔

(س۔ م۔ دانش۔ اورنگی۔ کراچی)

جی ایم سیّد اور
الطاف حسین صاحب

آج میں اس خط کے ذریعے بالخصوص آپ سے اور بالعموم عام پاکستانی سیاستدانوں سے درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ ہر قسم کا تعصب ختم کر دیجئے اور شہریوں کو ایک ملت بنا دیجئے۔

آپ جانتے ہیں کہ کچھ عرصے قبل پاکستان کا سب سے خوبصورت شہر کراچی تھا۔ قائد کا شہر..... اقبالؒ کے تصورات کی مانند جگمگاتا شہر۔ اور آج پاکستان کا سب سے ویران..... خوفزدہ شہر بھی کراچی ہی ہے۔ کیوں؟ صرف تعصب کی وجہ سے۔ خدارا! کراچی میں سندھی مہاجر کو اسی طرح یکجا کر دیجئے..... جس طرح محمدؐ نے مدینے میں انصار و مہاجر کو متحد کر دیا تھا..... آپ آج اس تاریخ کو دہرا دیجئے..... اور آپکو دہرانا ہی ہو گا..... !!!

نازیہ حسن اسلام آباد

مقابلہ نمبر ۷

غزل پزل

اُسامہ بن سلیم

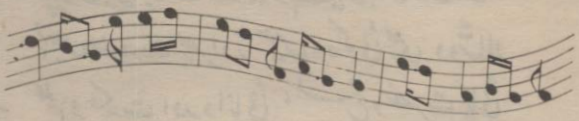

معلومات اور ذہانت کا منفرد ماہانہ مقابلہ

غزل پزل کا مقابلہ نمبر ۷، آپ کی ذہنی ورزش اور معلومات و مشاہدے کے امتحان کے لئے حاضر ہے..... تمام تصاویر، اسکیچز یا علامتوں کو غور سے دیکھئے اور پہچانئے۔ آپ اپنے تئیں جن جوابات پر مطمئن ہوں انہیں بھی کسی بڑے کو ضرور دکھا لیجئے تاکہ آپ کی محنت رائیگاں نہ جائے اور آپ کا نام کامیاب شرکاء کی فہرست میں شامل ہو جائے۔

اسکیچز یا علامتوں کو سمجھنے کے لئے اشعار کی مدد لے سکتے ہیں جوابات اکتوبر کی ۱۵ تاریخ تک پوسٹ کر دیں۔ اس کے بعد روانہ کئے جانے والے جوابات قابل قبول نہیں ہوں گے۔ جوابات کا کوپن پر آنا ضروری ہے جو صفحہ نمبر ۱۳۹ پر موجود ہے تمام درست جوابات بھجوانے والے ساتھیوں میں سے تین کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جائیں گے۔

(مرتب)

۱۔ طِب کا بانی، حکمت اور دانائی کا متوالا
اہلِ مغرب نے بھی اس کو مانا سب سے اعلا

۲۔ کیسے کیسے منظر اِس نے دکھلائے ہیں ہم کو
کوزے میں دنیا کو اِس نے کیسے بند کر ڈالا

۳۔ کون اشارہ کرتا ہے اور کیا کہتا ہے سمجھو
اس کو وہ سمجھے گا جو ہے کرکٹ جاننے والا

۴۔ بیچوں بیچ برف کے جو رہتے ہیں اِس میں اُن کو
نہیں ضرورت پھر اوڑھیں وہ کوئی بھی دوشالا

۵۔ علم و حکمت اور دانائی، فتح و نصرت پائی
دنیا بھر کے جرنیلوں میں کیسا نام نکالا

۶۔ اِک دوجے سے جوڑا اِس نے برقی رَو کے ذریعہ
باہم جُڑ کے دنیا دیکھو بن گئی کیسی مالا

۷۔ گھڑیوں کی ایجاد ہوئی ہے گرچہ بات پُرانی
اِس سے بھی پہلے تھا لیکن وقت سمجھنے والا

۸۔ کتنی عظمت والی ہو گی، کیسی رفعت والی
وقت نے لیکن اس کو بھی تو کھنڈر سا کر ڈالا

۹۔ لمحہ لمحہ گنتی جائے، جب چاہو رُک جائے
کیسا عجب نظام ہے اِس کا چلنے رُکنے والا

۱۰۔ اِس نے اُس کو، اُس نے اِس کو کیسے مار گرایا
طاقت اور مہارت کا ہے کیسا کھیل نرالا

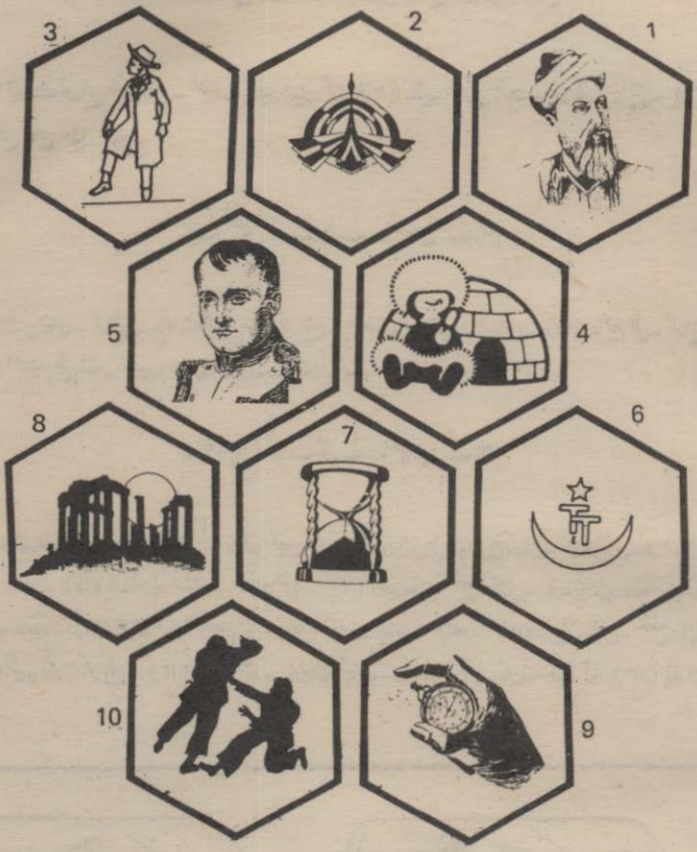

مقابلہ نمبر ۶ (ستمبر ۱۹۹۰ء) کے درست جوابات

(۱) مولانا روم۔ (۲) کار ریس کا جھنڈا۔ (۳) ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن۔ (۴) شاٹ پٹ۔ (۵) آئن اسٹائن۔ (۶) رخ (گھوڑا)۔ (۷) جھینگا مچھلی (۸) کیپسول (خلائی جہاز کا حصہ۔) (۹) کلوزیم ایمفی تھیٹر (روم) (۱۰) سپرمین۔

انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱) ثروت نورین انصاری۔ لطیف آباد حیدر آباد (۲) عالیہ خوش بخت۔ نارتھ کراچی۔ (۳) نادر علی خان حیدر آباد۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) اویس خان۔ کراچی۔ (۲) اقبال رضا۔ کراچی۔ (۳) نادیہ خان۔ کراچی۔ (۴) عاصم علی۔ کراچی۔ (۵) معصوم علی شاہ۔ لاہور۔ (۶) غلام شاہ۔ اسلام آباد۔

دو غلطیاں کرنے والے ساتھیوں کے نام

(۱) راشد طاہر اعوان۔ حیدر آباد۔ (۲) محمد سلمان خان۔ ضلع وہاڑی (۳) فرخ اکرام۔ آزاد کشمیر۔ (۴) انو شاہ مجاہد۔ لاہور۔ (۵) عبدالصبود عوان۔ اسلام آباد۔ (۶) وحید عامر۔ ضلع وہاڑی۔ (۷) عابد رضا سید۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔ (۸) محمد عامر۔ ضلع وہاڑی۔ (۹) آصف حیات۔ پشاور۔ (۱۰) فرخ ریاض۔ ضلع وہاڑی۔ (۱۱) ثوبیہ نثار۔ کراچی۔ (۱۲) سیزہ ارشد۔ راولپنڈی کینٹ۔ (۱۳) شمائلہ خان۔ حیدر آباد (۱۴) نثار احمد۔ مری۔

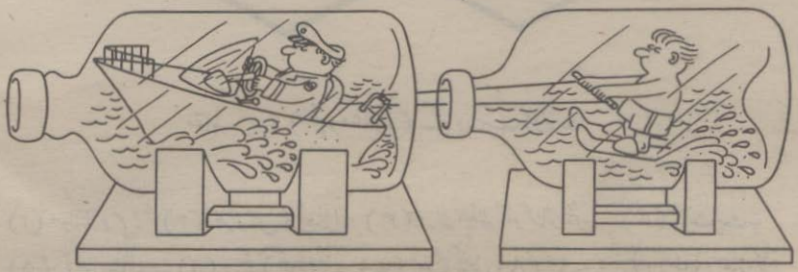

بلاعنوان

مقابلۂ پہچان کے درست جوابات

(۱) قائداعظمؒ۔ (۲) لیاقت علی خان۔ (۳) لیڈی ہارون۔ (۴) بیگم شاہنواز۔ (۵) محترمہ فاطمہ جناح۔ (۶) علامہ شبیر احمد عثمانی۔ (۷) سردار عبدالرب نشتر۔

(۸) چوہدری رحمت علی۔ (۹) علامہ اقبالؒ۔ (۱۰) نواب وقارالملک۔ (۱۱) نواب محسن الملک۔ (۱۲) حسن علی آفندی۔ (۱۳) سرسید احمد خان۔

(۱۴) مولانا ظفر علی خان۔ (۱۵) حسرت موہانی۔ (۱۶) نواب سلیم اللہ خان۔ (۱۷) حکیم اجمل خان۔ (۱۸) مولانا محمد علی جوہر۔ (۱۹) مولانا شوکت علی جوہر۔ (۲۰) مولانا عبید اللہ سندھی۔ (۲۱) سلطان محمد شاہ آغا خان۔

(۲۲) نواب محمد اسماعیل خان۔ (۲۳) راجہ صاحب محمود آباد۔ (۲۴) خواجہ ناظم الدین۔ (۲۵) حسین شہید سہروردی۔ (۲۶) سر عبداللہ ہارون۔ (۲۷) نواب بہادر یار جنگ (۲۸) چوہدری خلیق الزمان۔ (۲۹) مولوی فضل الحق۔

انعامات حاصل کرنے والے تین خوش نصیب ساتھی

(۱) فرزین ذوالفقار۔ کراچی۔ (۲) عثمان سید علوی۔ اسلام آباد۔ (۳) نازش لطیف۔ کراچی۔

درست جوابات دینے والے ساتھیوں کے نام

(۱) سید حیدر امام زیدی۔ کراچی۔ (۲) زبیر اشفاق انصاری کراچی۔ (۳) کامران طارق۔ کراچی۔ (۴) ہاجرہ بنیش۔ الیف بی ایریا۔ کراچی۔ (۵) وقار احسان۔ جہانگیر روڈ۔ کراچی۔ (۶) زی حشم رشید۔ کراچی۔ (۷) عبداللہ وقار احمد قریشی۔ کراچی۔ (۸) محمد ریحان شیخ۔ کراچی۔ (۹) اویس رضا خان۔ دستگیر کراچی۔ (۱۰) دانیہ جبار۔ کراچی۔ (۱۱) ہما فرخ۔ کراچی۔ (۱۲) ثناء فاطمہ۔ کراچی۔ (۱۳) امبرین یزدانی کراچی۔ (۱۴) طیب شاہ۔ کراچی۔ (۱۵) فیصل مرتضیٰ۔ کراچی (۱۶) شازیہ ارم۔ کراچی۔ (۱۷) سید محمد عدیل علی۔ کراچی۔ (۱۸) نعیم احمد ادیب۔ کراچی۔ (۱۹) محمد مراد احسان۔ کراچی۔ (۲۰) ثروت سعیدہ۔ کراچی۔ (۲۱) مدثر بشیر کراچی۔ (۲۲) محمد اجمل۔ سٹی کورٹ۔ کراچی۔ (۲۳) فرحت سعیدہ۔ کراچی۔ (۲۴) نگہت سیما۔ کراچی۔ (۲۵) حاجی عثمان پبلس۔ نو آباد کراچی۔ (۲۶) وسیم عباس۔ کراچی۔ (۲۷) عاطف عماد۔ کراچی۔ (۲۸) ارم فاطمہ زیدی۔ کراچی۔ (۲۹) اسماعیل جلال۔ کراچی۔ (۳۰) شازیہ غضنفر۔ کراچی۔ (۳۱) فرہاد وزیر علی۔ کراچی۔ (۳۲) عامر عزیز۔ کراچی۔ (۳۳) امین شیراز راجن۔ الیف بی ایریا کراچی۔ (۳۴) عزیزہ خان۔ نارتھ کراچی۔ (۳۵) راحیلہ نقوی۔ کراچی۔ (۳۶) امینہ خان۔ نارتھ کراچی۔ (۳۷) رافع اشفاق انصاری۔ کراچی۔ (۳۸) حمیرا خانم۔ کراچی۔ (۳۹) جویریہ کوثر علی الیف بی ایریا کراچی۔ (۴۰) شہزاد عبدالسلطان۔ کراچی۔ (۴۱) فرخ مشہود۔ کراچی۔ (۴۲) اویس احمد۔ کراچی۔ (۴۳) علی ساجد۔ کراچی۔ (۴۴) نعمان شوکت۔ آغا خان اسکول۔ (۴۵) علی حسن رضوی۔ گلبرگ۔ کراچی۔ (۴۶) آصف اکبر علی۔ کراچی۔ (۴۷) سید محمد علی لاریب۔ کراچی۔ (۴۸) سید ارشاد جیلانی۔ کراچی۔ (۴۹) عظمیٰ جاوید۔ کراچی۔ (۵۰) فردوس جاوید۔ کراچی۔ (۵۱) امتیاز جلیل۔ کراچی۔ (۵۲) انیلہ صبوحی کراچی (۵۳) فیاض احمد اعوان۔ کراچی۔ (۵۴) مطیبہ صدیقی۔ کراچی (۵۵) ہمایوں اختر۔ کراچی۔ (۵۶) فیصل حمید فاروقی۔ کراچی۔ (۵۷) محمد مظہر ریاض۔ کراچی۔ (۵۸) افشاں افتخار۔ کراچی۔ (۵۹) ہدا خان۔ نارتھ کراچی۔ (۶۰) خرم رشید۔ کراچی۔ (۶۱) نعیم اسلام کراچی۔ (۶۲) ظہیر عباس بیگ۔ کراچی (۶۳) سعد احمد شمسی۔ کراچی۔ (۶۴) محمد رضوان۔ کراچی۔ (۶۵) صائمہ خان۔ کراچی۔ (۶۶) حمید فلک ناز۔ کراچی۔ (۶۷) سید ابراہیم جلالی۔ کراچی۔ (۶۸) سید بشارت احمد۔ کراچی۔ (۶۹) فیصل مصطفیٰ کراچی۔ (۷۰) فہد سید۔ کراچی۔ (۷۱) سید مبارک احمد۔ کراچی۔ (۷۲) حمیر اظفر۔ کراچی۔ (۷۳) فوزیہ مشہود۔ کراچی۔ (۷۴) سائرہ اختر۔ کراچی۔ (۷۵) عماد حسن شاہ۔ بہار کالونی۔ کراچی۔ (۷۶) زاہد حسن علی کراچی (۷۷) اللہ ودھایا سومرا سکھر۔ (۷۸) طاہر شاہ۔ ضلع اٹک۔ (۷۹) علی قاسمی۔ لاہور (۸۰) غلام مصطفیٰ صدیق۔ لاہور۔ (۸۱) شاہ عالم۔ راولپنڈی۔ (۸۲) سعدیہ کنول۔ راولپنڈی۔ (۸۳) سید شبیر حسین شاہ۔ اسلام آباد۔ (۸۴) عاصم الحسن۔ لاہور۔ (۸۵) محمد بلال کھوکھر۔ لاہور۔ (۸۶) ناصر عظیم بھٹی۔ اٹک۔ (۸۷) عثمان سید لاہور۔ (۸۸) حماد مراز۔ اسلام آباد۔ (۸۹) مس سعدیہ راولپنڈی۔ (۹۰) شفقت علی اعوان۔ لاہور۔ (۹۱) محمد عمران قادر۔ ٹنڈو آدم۔ (۹۲) ثمینہ صدیق۔ ملتان۔ (۹۳) سید علی ہادی۔ پشاور۔ (۹۴) نادیہ سلیم۔ لاہور۔ (۹۵) محمد سعد فیصل۔ رحیم یار خان۔ (۹۶) عمر سید علوی۔ (۹۷) افضال وسیم۔ رائے ونڈ۔ (۹۸) دانش محمد سمیع۔ اسلام آباد۔

جو پیئے سگریٹ وہ ہے چمپینزی

سلمیٰ سلیم

ڈارون کا کہنا تھا کہ انسان بندر کی نسل سے ہے۔ ہمیں ڈارون کی بات کا یقین نہیں تھا مگر جب سے ہم نے یہ تصاویر دیکھی ہیں ہمیں اس بات پر کچھ کچھ اعتبار ہو چلا ہے۔ ان تصاویر سے صاف ظاہر ہے کہ انسان اور بندر (چمپینزی) میں ایک عادت مشترک ہے یعنی سگریٹ یا سگار پینے کی۔ جب سے ہم نے یہ تصاویر دیکھی ہیں ہم جب بھی کسی سگریٹ پینے والے کو دیکھتے ہیں ہماری ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ اب تک کئی بار پٹتے پٹتے بچے ہیں۔ دیکھئے آپ بھی ہماری طرح نہ کیجئے گا ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے

دوسرا رخ

منیر احمد راشد

وہ کافی دیر سے بس اسٹاپ پر کھڑا تھا..... شام ہو چکی تھی اور درختوں کے سائے طویل ہوتے ہوتے سڑک کے اس پار تک چلے گئے تھے..... آج گرمی بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی..... مئی کے آخری دنوں کی یہ شام اس کے لئے کافی تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی..... دفتر سے چھٹی ہونے سے ذرا دیر پہلے ہی باس نے اسے اپنے آفس میں بُلا کر خوب جھاڑا تھا۔ وہ اسٹینو گرافر تھا اور ایک ٹیکسٹائل مل میں ایک سخت مزاج باس سے اس کا سابقہ تھا جو بات بے بات ہر کسی کو ڈانٹنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ آج اسے بھی بلاوجہ ڈانٹ سننا پڑی تھی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی ایک کاروباری خط باس کی میز سے غائب ہو گیا تھا جس کا آج ہی پوسٹ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ وہ خط پوسٹ ہو چکا تھا اور باس کو یاد نہیں رہا تھا اس لئے اسے ڈانٹ سننا پڑی کہ خط کے پوسٹ ہو جانے کا باس کو یاد کیوں نہیں رہا.....

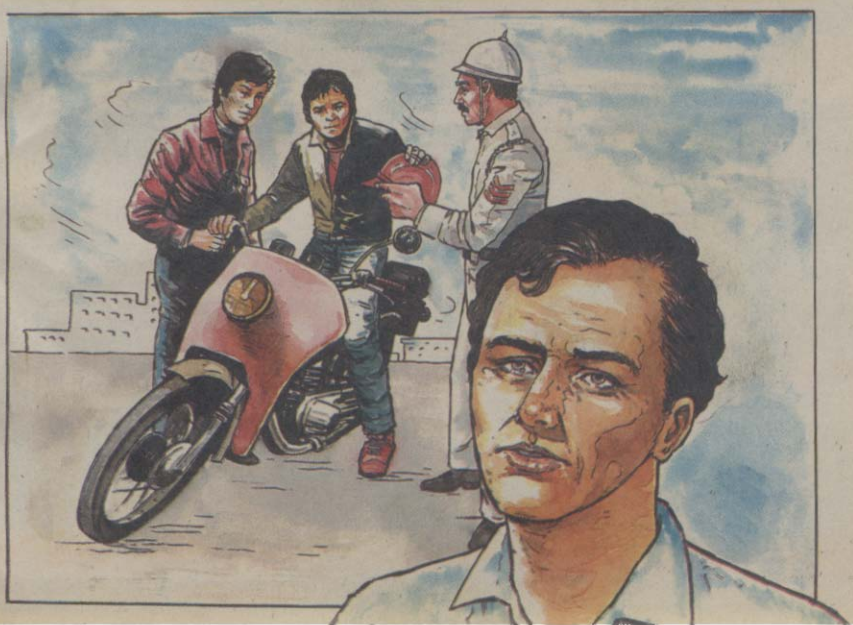

ایسے موقعوں پر اکثر وہ سوچا کرتا تھا کہ ان باس ٹائپ لوگوں کا حافظہ مزدور کی تنخواہ کاٹتے وقت کیوں جواب نہیں دے جاتا یا بونس دبانا یہ لوگ کیوں نہیں بھولتے..... شاید ان باتوں کا تعلق ان کے حافظے سے نہیں عادت سے تھا..... ہاں عادت جو بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے۔ جیسے خود اسے کڑھنے کی عادت تھی۔ محنت کا پھل نہ ملتا دیکھ کر کڑھنے کی عادت۔ باس کا کٹکھنا رویہ دیکھ کر کڑھنے کی عادت ..... کھانا دیر سے ملنے پر کڑھنا..... قمیص کا ٹوٹا ہوا بٹن دیکھ کر جلنا..... اس وقت بس کے طویل انتظار نے اس کا خون جلا رکھا تھا..... گرمی کا توڑ کر ہی کیا..... اور پھر وہ ٹریفک کانسٹیبل جو اسٹاپ سے کچھ دور چورنگی پر کھڑا تھا اور اس وقت دو موٹر سائیکل سواروں کو شکار کرنے کے چکر میں تھا، مسلسل اس کے غصے میں اضافہ کا باعث بن رہا تھا۔ یہ نوجوان اس کے سامنے ہی سامنے اس کانسٹیبل کا چوتھا شکار تھے۔ اس سے پہلے وہ ایک رکشہ اور دو موٹر سائیکل والوں سے خاصا نذرانہ وصول کر چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ذرا سا اختیار مل جانے پر آدمی آدمیت سے نیچے کیوں آجاتا ہے۔ ان کتوں کی طرح جو اپنے ہی ہم جنس کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیتے ہیں اور اگر بس چلے تو اسے بھنبھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر نفرت سے اس کانسٹیبل کو گھورا..... "پِتّو" وہ زیر لب بڑبڑایا ..... خون چوسنے والا ظالم..... جانور..... کیا میں اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا؟" اس نے سوچا ..... اور پھر کبھی بچپن میں سنی ہوئی حدیث کا مفہوم اس کے ذہن میں ابھرا..... برائی کو ہاتھ سے روکنا افضل ترین ایمان ہے..... اس سے کم تر درجے کا ایمان زبان سے برائی کو روکنا ہے..... "میں ضرور اس کو روک دوں گا۔" اس نے غصے سے سوچا اور تیزی سے کانسٹیبل کی جانب بڑھا جو موٹر سائیکل سوار سے پچاس روپے کا نوٹ لے کر جیب میں رکھ رہا تھا اس نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انتہائی غصّے میں اسے لعنت ملامت کرنے لگا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا کہہ رہا تھا بس وہ بولے جا رہا تھا..... وہ سب صلواتیں جو باس نے اسے سنائی تھیں اور ابھی تک اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں اس نے کانسٹیبل کو سنا دیں اور پچاس روپے کا نوٹ لے کر اس نوجوان کو دے دیا۔ نوجوان نے حیرت اور ممنونیت سے اسے دیکھا۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی اس کی بلند آواز گفتگو سن کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور ان کے گرد آکر کھڑے ہو گئے تھے..... کانسٹیبل اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا وہ اپنی صفائی اور نوجوان کی قانونی پوزیشن بتانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی.....

"یہ حرام خور چار آدمیوں کو میرے سامنے لوٹ چکا ہے حرام خوری تو ان کی فطرت میں شامل ہے۔" اس نے باس کی مخصوص گالی بھی اسی لہجے میں کانسٹیبل کو دی..... سب لوگوں نے مسکرا کر اور گردن ہلا کر گویا اس کی تائید کی۔ اس نے کانسٹیبل کو آئندہ کے لئے وارننگ دی..... اور نوجوان کو

شان بے نیازی سے اشارہ کیا "تم جاؤ اور اگر رستے میں کوئی تنگ کرے تو مجھے بتانا..... کسی سالے کو ایک پیسہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا جیسے شہر کا کمشنر وہی ہو۔ نوجوان نے شکریہ ادا کیا اور اپنے ساتھی کو موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر یہ جا وہ جا.....

وہ ابھی کانسٹیبل کو مزید لتاڑنے کے موڈ میں تھا کہ بس آگئی اور وہ بس میں سوار ہو گیا..... سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک مطمئن سی گہری سانس حلق سے خارج کی..... وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ایک عجیب سی طمانیت کا احساس اسے ہو رہا تھا حالانکہ گرمی کی شدت میں ذرا بھی کمی نہیں ہوئی تھی لیکن اب اُسے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے ایک اور گہری سانس لی اور سیٹ کی پشت پر سر کو ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔

..... ○ ..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

ہا! ہا! ہا! ہا!..... موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے ہوئے نوجوان نے اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ وہ لوگ اب اس اسٹاپ سے کافی آگے نکل آئے تھے اور اس وقت ایک چھوٹی اور نسبتاً سنسان سڑک پر چل رہے تھے موٹر سائیکل ڈرائیو کرنے والے نے بھی اپنے ساتھی کے قہقہے کا بھرپور ساتھ دیا..... دونوں بہت دیر تک ہنستے رہے۔

پھر اس نے ہنستے ہنستے کہا.....

"آج تو بُرے پھنسے تھے..... میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔"

"ہاں یار..... میں خود ڈر گیا تھا وہ تو بھلا ہو اس بے چارے ہمدرد کا ورنہ ساری اگلی پچھلی چوریاں اگلنا پڑ جاتیں۔" اس کے ساتھی نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں..... بے چارا ہمدرد..... اللہ بھلا کرے ہمارے پچاس روپے بھی بچوا دیئے..... ویسے یار پچاس روپے میں بھی یہ نئی سی ڈی سیونٹی مہنگی تو نہیں تھی۔" اس نے رازدانہ لہجے میں کہا اور فضا ایک بار پھر ان کے جاندار قہقہوں سے گونج اٹھی۔

آنکھ مچولی کو اپنی نگارشات ارسال کرنے والے ساتھیوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنا نام اور مکمل پتا تحریر کے اختتام پر صاف اور خوش خط لکھا کریں۔ آئندہ سے جن مسودوں پر لکھنے والے کا نام نہیں ہوگا اُنھیں ضائع کر دیا جائے گا (ادارہ)

سگریٹ نوشی

عادت یا لعنت

انگلستان کے مشہور شاعر ٹینی سن نے دوستوں اور عزیزوں کی روز روز کی ملامت سے تنگ آکر فیصلہ کرلیا کہ وہ تمباکو نوشی نہیں کرے گا۔ ٹینی سن کے نیک ارادے کی سب نے تعریف کی۔ شام تک وہ خود بھی اس فیصلے پر پورے عزم کے ساتھ جما رہا۔ رات جب وہ سویا تو وہ فتح کے نشے سے سرشار تھا کہ اس نے تمباکو نوشی کی موذی عادت پر قابو پالیا ہے۔ یہ دوسری صبح کی بات ہے۔ گھر کے تمام لوگ پریشان تھے کہ ٹینی سن کہاں گئے۔ تلاش شروع ہوئی کہ ٹینی سن کہاں گئے۔ گھر کا کونا کونا چھان مارا گیا۔ ٹینی سن نہ ملے۔ گھر کا ایک بچہ جو شاید بہت چونچلا، شریر اور تیز تھا چھت پر جا چڑھا۔ اچانک اس کی نظر گلی میں ایک

شخص پر جا پڑی جو بیٹھا کوڑے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ بچے نے شور مچا دیا لوگوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ ممی سن ہیں۔ پسینے سے شرابور بُری حالت، سانس بے قابو۔ پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے تو فرمایا پائپ تلاش کر رہا ہوں۔ لوگوں نے انہیں کل کا فیصلہ یاد دلایا تو بولے "کچھ نہیں" ایک شرمندہ مسکراہٹ ان کے دل کے حال اور "آہنی عزم" کی چغلی کھا رہی تھی۔

آخر سگریٹ یا تمباکو میں ایسی کون سی شے ہے جو انسان کو اس کا عادی بنا دیتی ہے اور وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس موضوع پر ایک عرصہ سے تحقیق ہو رہی ہے جو ہمارے سامنے آچکی ہے اور مزید تحقیق جاری ہے جس سے نت نئے انکشافات ہوتے رہیں گے۔ ایک زمانہ تھا کہ مشرق اور مغرب میں تمباکو کو بطور دواء استعمال کرایا جاتا تھا۔ تمباکو خاص طور پر خون کے دباؤ کے امراض کے لئے استعمال کرایا جاتا ہے۔ ہم نے اوپر تمباکو کے فائدہ کا ذکر کیا ہے اب ذرا نقصان بھی پڑھ لیں۔

تمباکو میں ڈیڑھ درجن کے قریب زہر پائے جاتے ہیں۔ جبکہ اس میں رتی برابر بھی غذائیت نہیں ہوتی۔ پولی سائکلک، اریو مائک، اور ہائیڈروجن گیس بھی موجود ہوتی ہے۔ تمباکو کے دھوئیں میں نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ اور ہائیڈروجن سائنائیڈ ہوتی ہے۔

نکوٹین کے زہر کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ نکوٹین کا ایک قطرہ ایک کتے کو مارنے کے لئے کافی ہے۔ جبکہ کسی پرندے کو سنگھا دینا ہی کافی ہے۔ حقے کے پانی میں نکوٹین شامل ہوتی ہے کیونکہ دھواں پانی میں سے ہو کر باہر نکلتا ہے۔ چین کے باشندے اس پانی کو خودکشی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یورپ کے سائنس دانوں کے تجربات کے مطابق نکوٹین کی ایک رتی مقدار ایک صحت مند آدمی کو قتل کرنے کے لئے کافی ہے۔ جدید ترین تحقیق کے مطابق کثرت سگریٹ نوشی سے، گلے کے امراض ، پیٹ کے السر، خون میں خرابی، نزلہ و زکام، دل کی بیماری، دق، کمزوری، کھانسی، آواز کا بیٹھنا، نظر کی کمزوری اور دماغی امراض بھی پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کینسر کی بڑی وجہ سگریٹ نوشی ہے۔ ایک جائزے کے نتیجے میں یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ سگریٹ نوشی کے باعث ہر آٹھ سال کے بعد ۲۵ لاکھ افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ جبکہ دنیا کی چالیس فیصد آبادی سگریٹ کی عادی ہے۔ ایک عالمی اندازے کے مطابق سگریٹ نوشی کے باعث ہلاک ہونے والوں کی تعداد حادثات میں مرنے والوں سے پانچ گنا زیادہ ہے۔ عام خیال ہے کہ سگریٹ کے نوجوانوں پر مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ یہ خیال غلط ہے، سگریٹ نوشی کے باعث نوجوانوں کی قوت ارادی تباہ ہو جاتی ہے اور قوت مدافعت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس طرح دماغ کی نشوونما بھی رک جاتی ہے اور تدریسی سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں۔

ڈنڈا ڈولی

ان صفحات میں ہم ہر ماہ کسی ایک موضوع کے ساتھ ڈنڈا ڈولی کرتے ہیں
نومبر کے لئے موضوع ہے "وکیل"، جبکہ دسمبر کا موضوع ہو گا "بچے"

(انعامی لطیفہ)

بعض اوقات ڈاکٹر اپنی لاپرواہی سے موت اور زندگی کے درمیان فاصلے بہت کم کر دیتے ہیں آپریشن ٹیبل پر مریض کو دیکھتے ہوئے سینئر سرجن نے نئے سرجن سے کہا "آپ نے یہ کیسا آپریشن کیا ہے؟" نئے سرجن نے چونک کر جواب دیا۔ "کیا اس کا آپریشن کرنا تھا میں نے تو پوسٹ مارٹم کیا ہے۔"

(یاسر بن نثار ...... راولپنڈی)

ڈاکٹر حضرات کی ہینڈ رائٹنگ کتنی خوب صورت ہوتی ہے یہ سب جانتے ہیں
ایک ڈاکٹر صاحب کو بچوں کے لئے ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے اشتہار دیا کہ "بچوں کی پڑھائی کے لئے ٹیوٹر کی ضرورت ہے" جب اشتہار چھپا تو کچھ یوں تھا "بچوں کی پٹائی کے لئے ہنٹر کی ضرورت ہے۔

عامر زیدی۔ حیدر آباد

☆ ایک شخص نے دیکھا کہ شہر کا ڈاکٹر کندھے پر بندوق اٹھائے کہیں جارہا ہے اس شخص نے پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا فلاں گاؤں میں مریض دیکھنے جارہا ہوں۔ اس شخص نے کہا۔ مریض کے لئے تو آپ کی دوا ہی کافی ہے بندوق کی کیا ضرورت ہے۔

روبینہ ناز ۔ مخدوم پور

☆ ایک ڈاکٹر اپنے بیٹے کو حساب سکھا رہا تھا۔ اس نے سوال لکھواتے ہوئے کہا۔ ایک کمرے میں پلستر لگوانے کا خرچ......

بیٹا (بات کاٹتے ہوئے) ڈیڈی کیا اس کمرے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی؟

(ریاض احمد حضرو)

بچاؤ بچاؤ بچاؤ

☆ میاں بیوی اپنے چار سالہ بچے کو پیار کر رہے تھے کہ میاں نے کہا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہمارا ننھا ڈاکٹر بنے گا۔

بیوی...... آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟

شوہر...... اس طرح کہ یہ گھر آنے والے لوگوں کی جیبیں پہلے دیکھتا ہے اور پھر ان سے کوئی بات کرتا ہے۔

(تنویر شہزاد...... شاہی بازار بہاولپور)

☆ ڈاکٹر صاحب وارڈ کا چکر لگا رہے تھے کہ بولے اس مریض کی کیا حالت ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ بکتا رہتا تھا؟

نرس...... حالت ویسی ہی ہے آپ کو آتا دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

عزرائیل آرہا ہے! عزرائیل آرہا ہے!!"

ندیم شاہد ، خانیوال

☆ ایک ہپی جو کسی جلدی مرض میں مبتلا تھا، ڈاکٹر

کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے اس کا مکمل معائنہ کیا اور ایک پیکٹ اسے دیتے ہوئے بولا "یہ لو دن میں تین مرتبہ استعمال کرنا۔"

"یہ کیا ہے، جناب؟" ہیپی نے سوال کیا؟۔

"صابن" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

(توفیق سجاول ..... اسلام آباد)

☆جوتوں کی دوکان کے پوسٹر کے اوپر کسی نے ایک ڈاکٹر کے کلینک کا پوسٹر لگا دیا کچھ دنوں بعد بارش کی وجہ سے اوپر والا پوسٹر جگہ جگہ سے پھٹ گیا اب اشتہار کچھ یوں پڑھا جاتا تھا۔

"ہمارے ہاں عمدہ قسم کے مریض مل جاتے ہیں جوتوں کو پولیو کے ٹیکے لگانے کا خاص انتظام ہے۔ چیچک کے مریضوں کو ایک سال کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ ناکارہ مریضوں کی سلائی کے لئے تشریف لائیں۔ نت نئے ڈیزائنوں میں مریض تیار کئے جاتے ہیں۔ فیشن ایبل جوتوں کا بھی علاج کیا جاتا ہے۔"

(محمد آصف ..... شیخوپورہ)

☆ایک صاحب ڈاکٹر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کی وجہ سے آج بہت خوشحال اور صحت مند ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے گھبراتے ہوئے جواب دیا "مگر محترم معاف کیجئے گا میں نے تو آپ کا علاج نہیں کیا۔" "میرے داد کا تو کیا ہے۔ آج میں تن تنہا ان کی ساری جائیداد کا وارث ہوں۔" ان صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

(محمد خرم معراج ..... سکھر)

ایک ڈاکٹر اور ایک وکیل صاحب میں بڑی دوستی تھی، ایک دن بے تکلفی سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب وکیل سے بولے! "تم لوگوں کا کیا کہنا انسان کو تین فٹ زمین سے اوپر لٹکوا دیتے ہو۔" یہ سن کر حاضر جواب وکیل صاحب کب چوکنے والے تھے، فوراً بولے "فرق صرف اوپر نیچے کا ہے، ہم تین فٹ اوپر لٹکواتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب! آپ آدمی کو تین فٹ زمین کے نیچے سلا دیتے ہیں۔"

سید شاہد احمد انصاری۔ کراچی

دورِ جدید کے دو مریض

ڈاکٹر نے مریض سے کہا: "یہ گولیاں دل کے لئے ہیں۔ یہ معدہ کے لئے اور یہ گولیاں جگر کے لئے....."

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔ مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہر گولی اپنے ٹھیک مقام پر جائے گی؟" مریض نے حیرت سے پوچھا۔

سیّد کاشف طاہر..... ریاض۔ سعودیہ

ہسپتال میں نمونیا کا ایک مریض اسی دن صحت یاب ہوا تھا اس نے نرس سے کھانا مانگا، لیکن ڈاکٹر نے اسے کھانا دینے سے منع کر دیا تھا۔ جب اس نے بہت ضد کی تو نرس نے چائے کے چمچے میں ابلے ہوئے چاول لا کر دے دیئے۔

مریض نے چاول کھا کر نرس کا شکریہ ادا کیا اور پھر بولا "اب میں کچھ پڑھنا چاہتا ہوں۔ ڈاک کا کوئی ٹکٹ ہو تو لے آؤ"

سیّد تقی جعفر۔ کراچی۔

غضب خدا کا! تم اب میرے پاس آئے ہو غصہ ور ڈاکٹر نے مریض سے کہا "مجھ سے پہلے بھی کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہو گا؟"

جی نہیں میں کیمسٹ کے پاس چلا گیا تھا۔

"کھلی جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا وہ علاج کرنا کیا جانے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیر یہ بتاؤ کہ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا"

جی اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا

محمد اعجاز خان بابر زئی۔ جامشورو

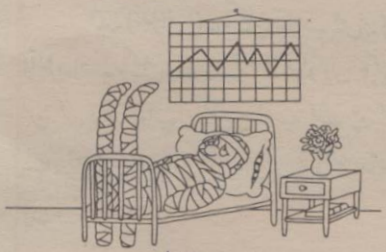

بلاعنوان

ڈاکٹر..... میں مریض کی آنکھ دیکھ کر مرض بتاتا ہوں۔

دیکھو، تمہاری بائیں آنکھ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تپ دق ہے۔

مریض ..... جناب، میری یہ آنکھ مصنوعی ہے۔ (محمد شاہد صدیق طور..... ، صادق آباد)

شاپنگ جو کر رہا ہوں
تو
حیران کیوں ہیں آپ ؟

بے چارے بچے

شاہنواز فاروقی

جولی خاک بھرے میدان میں پتھر سے ٹیک لگائے پھٹا پرانا میگزین پڑھ رہی تھی۔ یہ میگزین اسے آج ہی ایک گلی کے کوڑے دان میں سے ملا تھا۔ اس کا بھائی مارکو اس کے قریب ہی ایک تختے پر بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ اسے کچھ پریشان کن خیالات نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ اٹلی ہے ان بچوں کا گھر..... مگر کیسا گھر؟

یہ شہر جو کہ کبھی بہت ہی خوبصورت تھا اب دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اس شہر کے جنوبی حصہ میں زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ دکانیں کھلی تھیں۔ لوگ خریداری کر رہے تھے اس کے برعکس شمالی حصہ میں جنگ نے تباہی پھیلائی ہوئی تھی۔ ہر گھر کہیں نہ کہیں سے منہدم تھا، ہر دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ اور اب شہر کا یہ حصہ "بھوت نگر" کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔

شہر کے ان کھنڈرات میں وہ بچے رہتے تھے جن کے گھر برباد ہو گئے تھے اور جن کے والدین اور عزیز و اقارب جنگ میں ہلاک ہو چکے تھے۔ بچے رات کی تاریکی میں بچے کھچے مکانوں میں داخل ہوتے

اور مکینوں سے کھانے پینے کی اشیاء چھین کر فرار ہو جاتے۔ تاہم اس کے باوجود ان کے اکثر دن فاقوں میں گزرتے۔ ان کے پیلے پڑتے ہوئے اور لاغر ہوتے ہوئے جسم اس کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔

مارکو اور جولی نے اس جنگ میں اپنا بہت کچھ کھو دیا تھا۔ ان کا گھر بمباری میں تباہ ہو چکا تھا اور ان کے والدین ہلاک ہو چکے تھے۔ اس دنیا میں اب ان کا کوئی نہیں تھا۔ مہینوں سے درندوں حیوانوں کی طرح ادھر ادھر سے کھانے کی چیزیں کھاتے پھرتے تھے۔ اگرچہ جنگ ختم ہو چکی تھی مگر امن نے بھی ان بچوں کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

"میں آج رات اپنے گروہ کے ساتھ جاؤں گا۔" اچانک مارکو نے کہا۔ جولی نے میگزین سے نظریں ہٹا کر اپنے بھائی کی جانب دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں خوف سے بھری تھیں۔

"مارکو!" اس نے کہا" تمہیں معلوم ہے کہ گروہ کے بچے کیا کرتے ہیں؟.....وہ دکانوں، مکانوں اور ریسٹورانوں سے کھانا چوری کرتے ہیں۔ اور پھر تم نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ تم کبھی یہ کام نہیں کرو گے۔" مارکو نے اپنے کاندھے جھٹکے اور بولا

"مگر ہم بھوکے ہیں۔ مجھے یہ کرنا ہی ہو گا۔"

"مگر چوری نہ کرنا....." جولی نے کہنا چاہا۔

"جب زندگی گزرانے کا ڈھنگ بدلتا ہے تو انسان کے خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ یا ان کو بدل جانا چاہئے۔" مارکو نے کہا۔ یہ دراصل وہی دلیل تھی جو اس نے اپنے گروہ کے بڑوں سے سنی تھی۔ "رڈولف کہتا ہے کہ اگر ہم زندہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی صحت کو برقرار رکھنا چاہئے۔ اگر ہم کھانا نہیں کھائیں گے تو مر جائیں گے۔ بس میں تھوڑا سا کھانا چراؤں گا۔ بس تھوڑا سا جولی۔ اتنا جتنے کی ہم دونوں کو ضرورت ہے" مارکو نے کہا۔

"لیکن اگر تم پکڑے گئے تو.....؟۔" جولی نے کہا پھر وہ چپ ہو گئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مارکو جو فیصلہ کر چکا ہے اس پر ضرور عمل کرے گا۔ بہرحال وہ دونوں کئی روز سے بھوکے تھے تو وہ اس بے چارے کو کیا الزام دیتی۔

مارکو نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ کھانا چرانے پر اسے کس چیز نے مجبور کیا ہے۔ یہ اس کی بھوک نہیں تھی جس نے اسے کھانا چرانے پر مجبور کیا تھا بلکہ یہ راجر کا دل کو چیر دینے والا تبصرہ تھا۔ اس نے کہا تھا "اگر میری بہن ہوتی اور وہ جولی کی طرح بھوکی ہوتی تو میں ہرگز بھی اس کے لئے کھانا چراتے ہوئے نہ ڈرتا"۔ اسی دوپہر کو رڈولف اور راجر خوف زدہ حالت میں مارکو کے پاس آئے اور بولے "ہم آج رات کھانا چرانے نہیں جائیں گے۔"

"مگر کیوں"؟ مارکو نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم نے سنا ہے کہ آج پولیس نے حفاظتی اقدامات سخت کئے ہوئے ہیں اور وہ کوشش کر رہی ہے کہ راستوں کو بند کر کے چوری کرنے والے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں گرفتار کرے اور انہیں دارالامان بھیج دے"۔

"دار الامان" جولی بڑبڑائی۔ "یہ تو اچھی بات ہو گی"۔

"جولی" رڈولف چلّایا "کیا تم چاہتی ہو کہ ہماری آزادی ختم ہو جائے اور ہم ایک جیل نما گھر میں بند ہو کر رہ جائیں"۔

"ایسا کبھی نہیں ہو گا" مارکو نے جوش کے ساتھ کہا۔

"ہم کبھی بھی دارالامان نہیں جائیں گے" راجر اور رڈولف نے مارکو کی مزید تائید کی۔ جولی لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتا چھوڑ کر چلی گئی اور دوبارہ میگزین پڑھنے میں منہمک ہو گئی..... "بہرحال دارالامان ایسی جگہ سے تو اچھا ہی ہو گا صاف ستھرا" جولی نے سوچا۔

رڈولف اور راجر کے جانے کے بعد مارکو نے غصہ کے ساتھ اپنی بہن کی جانب دیکھا اور بولا۔

"میگزین جلدی ختم کرو۔ مجھے بھی پڑھنا ہے۔"

"تم کوئی اور تلاش کر لو۔" جولی نے جواب دیا۔

"ہاں کر لوں گا" مارکو نے سوچا اور پھر وہ پتھروں کے ڈھیر سے کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ پتھروں اور اینٹوں کو ہٹانے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے ایک پھٹا ہوا۔ مگر چھپا ہوا کاغذ ہاتھ لگا۔ اس کی امید بندھی اور وہ تیزی کے ساتھ ڈھیر پر مصروف ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس کے ہاتھ میں کاغذ کے کئی ٹکڑے آئے۔ یہ نہ تو کتاب کے حصے تھے، نہ ہی اخبار کے، بلکہ یہ نوٹ تھے۔ یعنی روپے..... "روپے" مارکو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جولی، جولی دیکھو" وہ چلایا۔

جولی نے میگزین کو زمین پر رکھا اور تیزی سے مارکو کی طرف دوڑی۔ اور پھر وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ روپے نکالنے میں مصروف ہو گئی۔

"زبردست..... زبردست" وہ چلائی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "اب ہم نہ صرف اپنے لئے بلکہ باقی بچوں کے لئے بھی کھانا خرید سکیں گے" اس نے کہا۔

"ہاں آج کی رات سب کو عمدہ کھانا ملے گا..... اور کل ایک ایک جوڑی جوتے بھی۔" مارکو نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

دونوں بچے بہت خوش تھے۔ انہوں نے ایک ساتھ اتنے سارے روپے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے خوش قسمت ترین افراد تصور کر رہے تھے۔

اچانک مارکو خاموش ہو گیا۔ اور تیزی کے ساتھ روپے اپنی جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔

"جولی" اس نے کہا "اگر ہم ان پیسوں سے بچوں کے پورے گروہ کے لئے کھانا خریدیں گے تو یہ پیسے ایک ہی ہفتے میں ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر ہم سب اسی طرح بھوکے رہا کریں گے جیسے آج سے پہلے رہتے تھے۔ کیوں نہ ہم ریل کا ٹکٹ خرید کر فرانس میں دادی ماں کے پاس چلیں۔"

جولی زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اور پھر اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ درحقیقت ان کا فرانس جانا ان کی سب مشکلوں کا حل تھا۔

"آؤ جلدی سے اسٹیشن چلیں" جولی نے کہا۔

"ان کے پاس سنبھالنے کے لئے اگر کچھ تھا تو بس وہ نوٹ اور پھٹا ہوا میگزین۔ چنانچہ وہ دونوں چند ہی منٹوں میں اسٹیشن جا پہنچے۔

اور ٹھیک اس وقت جب مارکو ٹکٹ لینے کے لئے ٹکٹ کھڑکی کی طرف جا رہا تھا، جولی نے کھڑے ہو کر اس ہچکچاتے ہوئے لہجے میں مارکو کو مخاطب کیا جس سے مارکو بخوبی واقف تھا۔

"مارکو...... کیا تم نہیں سمجھتے کہ......"

"خدا کے لئے جولی...... مارکو نے بے صبری کے ساتھ کہا" تم یہی کہنا چاہ رہی ہو نا کہ یہ روپیہ ہمارا نہیں ہے اور اس لئے ہمیں اسے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ ذرا اپنے والدین کے ان روپوں کے بارے میں سوچو، جو گھر کے ملبے میں دب گئے ہیں اور جو ہماری طرح کے بچوں کو کسی روز مل جائیں گے۔ اور شاید ان بچوں کو بھی ہماری طرح پیسوں کی سخت ضرورت ہو۔ اب دیکھو نا ہمیں ان پیسوں کی ضرورت تھی۔ بس یوں سمجھو خدا نے خاص طور پر یہ روپیہ ہمارے لئے ہی بھیجا ہے۔ ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔" مارکو نے طویل تقریر کر کے اپنی بہن کو مزید کچھ کہنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ اور تیزی کے ساتھ ٹکٹ کھڑکی پر جا کر ٹکٹ لینے لگا۔

چند لمحوں کے بعد وہ جولی کو فرانس کے قیمتی ٹکٹ دکھا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمارے پاس اب بھی خاصے روپے موجود ہیں۔ یہ ریل تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں جائے گی اس لئے آؤ کھانا کھا لیں اور پھر شہر جا کر باقی روپے رڈولف کو دے آئیں۔"

جب وہ فرانس جانے کے لئے ریل میں بیٹھے تو انہیں یاد آیا کہ انہوں نے جوتے تو خریدے ہی نہیں۔

"پرواہ مت کرو۔" مارکو نے کہا "انشاء اللہ کل ہم دادی ماں کے پاس ہوں گے اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ریل میں سوار ہونے سے قبل انہوں نے کھانے پینے کی کچھ اشیاء اور چند کتابیں خرید لی تھیں۔ اور اب وہ رڈولف کی اس خوشی کے بارے میں سوچ رہے تھے جو اسے اتنے سارے پیسے پاکر ہوئی ہوگی۔
پھر ان کے خیالات دادی ماں کی طرف مرکوز ہوگئے۔ وہ بہت دنوں سے دادی کے پاس نہیں گئے تھے۔ مگر انہیں دادی کی محبت، ان کی شفقت بہت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ ابو امی کی موت کی خبر سن کر کتنی غمزدہ ہوں گی۔ مگر شاید ہمیں دیکھ کر خوش بھی ہوں گی۔ " انہوں نے خیال کیا "جب ہم دادی کے پاس ہوں گے تو پھر ہمیں اچھا کھانا اور اچھا لباس میسر آئے گا اور بہت سی کتابیں بھی۔ ہمارے سروں پر چھت ہوگی اور ساتھ ہی دادی ماں کا بہت سا پیار" وہ دونوں سوچتے رہے۔
اگرچہ سفر طویل تھا مگر مارکو اور جولی نے اسے مزے میں گزارا۔ ان کے ڈبے کے مسافر بڑے اچھے تھے جب ان لوگوں نے دونوں بچوں کی کہانی سنی تو سب ان کا اور خیال کرنے لگے۔
اگلی صبح وہ دونوں فرانس میں تھے۔ ان کی نظریں دادی کے گھر کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں۔ وہ اگرچہ خاصے تھک گئے تھے مگر پھر بھی ہشاش بشاش تھے۔ وہ آپس میں فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ درحقیقت وہ فرانسیسی میں گفتگو کر کے دادی سے بات چیت کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ انہیں فرانسیسی بولے ہوئے بہت دن ہوگئے تھے اور پھر ان کی فرانسیسی اتنی اچھی نہ تھی۔
"وہ رہا...... وہ رہا" جولی نے دادی کے گھر کو دیکھ کر نعرہ لگایا۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور بے چینی کے ساتھ اس کے کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ گھر کے اندر قدموں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ "بس چند لمحوں میں دادی اماں ہمارے سامنے ہوں گی اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ان دونوں نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ سوچا۔
دروازہ کھلا اور ایک عورت نمودار ہوئی۔ یہ دادی اماں نہیں تھیں۔
"دادی اماں ...... ؟ مارکو نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم مارسل ہوں گی؟"
"میڈم مارسل کا تو انتقال ہوگیا۔" اس عورت نے نرم لہجے میں کہا۔
"چھ ہفتے قبل وہ اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی تھیں۔" عورت نے کہا۔
"اوہ" مارکو کے منہ سے نکلا۔
عورت نے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بچوں کو تجسس کے ساتھ دیکھا۔

"کیا تم میڈم مارسل کے اٹلی والے پوتا پوتی ہو؟" عورت نے دریافت کیا۔ "جی ہاں" مارکو نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارا گھر بمباری میں تباہ ہو گیا اور والدین اس کے ملبے میں دب کر مر گئے۔ ہم فرانس میں دادی کے پاس رہنے آئے تھے۔"

"بے چارے معصوم بچے۔" عورت نے جس کا نام مادام ہینری تھا افسوس کے ساتھ کہا۔ پھر وہ بولی، "آؤ بچو اندر آؤ اور مجھے سناؤ کہ تم پر کیا گذری۔ تم تھکے ہوئے ہو اور لگتا ہے کہ بھوکے بھی ہو، میں تمہیں ابھی دو منٹ میں کافی بنا کر پلاتی ہوں۔ کافی شاید مزے کی نہ ہو مگر ہم غریب لوگ ہیں اس سے اچھی کافی تم کو نہیں پلا سکتے۔"

اس نے بچوں کو اپنے بازوؤں میں بھرا اور گھر کے اندر لے گئی۔ اس نے انہیں گرم کافی اور کیک دیا تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے پڑوسیوں کو بچوں کو دیکھنے کے لئے بلایا۔

"میڈم مارسل کے اٹلی والے پوتا پوتی۔" اس نے پڑوسیوں سے بچوں کا تعارف کرایا۔ "بیچارے اپنی دادی سے ملنے آئے تھے، مگر وہ ان کے آنے سے بہت پہلے ہی انتقال کر گئیں۔"

پڑوسیوں نے توجہ اور افسوس کے ساتھ بچوں کی کہانی سنی۔ بچے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے۔ پڑوسی افسردہ تھے مادام ہینری افسردہ تھیں۔ سب کے لبوں پر بار بار "بے چارے بچے" اور "افسوس" کے الفاظ آ رہے تھے۔ دونوں بچوں نے اپنے والدین کی وفات کے بعد اب تک نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا تھا اور بالکل نہیں روئے تھے، مگر اب سب لوگوں نے ان کے ساتھ کچھ اس طرح ہمدردی جتائی تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے۔

اس رات مہینوں کے بعد وہ گرم پانی سے نہائے اور انہوں نے اچھا کھانا کھایا۔ مادام ہینری نے انہیں اپنے بستر پر سلایا۔ انہوں نے سینکڑوں بار ہی بچوں کے پھول جیسے گال چومے اور بہت بار بے چارے بچے، پیارے بچے کہتا بچے سو گئے تو وہ اپنے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں مادام ہینری کا خاندان خاصا بڑا تھا۔ اس لئے ان کے چھوٹے سے گھر میں کم جگہ تھی چنانچہ اس رات مادام ہینری کو زمین پر سونا پڑا۔

یونہی پانچ روز گزر گئے مادام ہینری بہت محبت کرنے والی ثابت ہوئی تھیں وہ ایک غریب خاتون تھیں مگر انہوں نے خود بھوکا رہ کر ان دونوں بچوں کو اچھی غذا کھلائی ایک پڑوسی نے انہیں اپنے بچوں کے کپڑے لا دیئے تھے بستی کے تمام لوگ دونوں کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ مارکو اور جولی اب محسوس کرنے لگے تھے کہ زندگی اتنی بھی مشکل نہیں جتنی کہ وہ سمجھتے تھے۔ لیکن چند ہی روز بعد ان کو ایک اور پریشانی نے آگھیرا۔

اس دن وہ دونوں کمرے میں بیٹھے ایک فرانسیسی کہانی پڑھ رہے تھے کہ باورچی خانے سے مادام

کی آواز آئی وہ بلند آواز میں گفتگو کرنے کی عادی تھیں۔ چنانچہ ابتداء میں تو بچوں نے ان کی آواز کا کوئی نوٹس نہیں لیا مگر چند ہی لمحوں بعد انہیں احساس ہو گیا کہ وہ انہی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ وہ اپنی ایک پڑوسن سے کہہ رہی تھیں۔

"میرا تو دل چاہتا ہے کہ ان بچوں کو اپنے ساتھ ہی رکھوں مگر بہن تم تو جانتی ہو کہ ایک تو میرے یہاں رہنے کی جگہ ہی کم ہے اور پھر اس بڑھتی ہوئی مہنگائی کے زمانے میں میرے اپنے خاندان کا گزارہ ہی مشکل سے ہو پاتا ہے۔ اس لئے بہت دنوں تک ان دونوں کا بوجھ اٹھانا میرے لئے ممکن نہیں ہو گا۔"

"ہاں بہن تم ٹھیک کہتی ہو۔" پڑوسن نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "کل چار بجے البتہ۔ مادام ہینری نے کہا میں نے پولیس سے بات کی ہے وہ ان بچوں کو دارالامان میں داخل کر دے گی۔ مجھے معلوم ہے وہ بچے اس گھر سے مانوس ہو گئے ہیں، اور ہرگز یہاں سے جانا نہیں چاہیں گے۔ مگر کیا کیا جائے انہیں جانا ہی ہو گا، بے چارے بچے، معصوم بچے۔"

"جانا ہی ہو گا۔" مارکو اور جولی نے بڑبڑاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے تھے اور انہیں لگ رہا تھا جیسے خون ان کی رگوں میں جم گیا ہو۔

"نہیں" مارکو نے کہا "ہم کبھی بھی دارالامان نہیں جائیں گے یہ ہماری بے وقوفی تھی کہ ہم نے یہ سوچا کہ مادام ہینری ہمیں ہمیشہ اپنے پاس رکھیں گی۔" جولی نے کہا "لیکن بہر حال وہ بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں ان کے پاس واقعی رہنے کو کم جگہ ہے۔ جب سے ہم آئیں ہیں وہ خود زمین پر سوتی ہیں۔"

"ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے۔" مارکو نے کہا۔ چنانچہ دونوں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنالیا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ کل دوپہر کا کھانا کھاتے ہی وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ جاتے ہوئے مادام ہینری کے لئے ایک خط لکھیں گے اور پھر کبھی بھی وہاں واپس نہیں آئیں گے۔

مگر ان کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ اگلی صبح گیارہ بجے کے قریب ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مادام ہینری بچوں کو دارالامان جانے کے بارے میں بتانے ہی والی تھیں، بلکہ انہوں نے یہ کہہ بھی دیا تھا۔

"میرے پیارے بچو..... میں تم سے ایک بات کرنا چاہ رہی ہوں....." مگر دروزاے کی دستک نے انہیں اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔ انہوں نے دروزاہ کھولا تو دیکھا کہ ایک پولیس والا اور دارالامان کی ایک خاتون باہر کھڑے ہیں۔

(جاری ہے)

نظمی نسخے

مرسلہ :۔ ظہور الحسن ..... ٹنڈو آدم

جہاں تک کام چلتا ہو غذا سے
وہاں تک چاہئے بچنا دوا سے

اگر خوں کم بنے بلغم زیادہ
تو کھا گاجر چنے، شلغم زیادہ

جگر کے بل پہ ہے انسان جیتا
اگر ضعفِ جگر ہو کھا پپیتا

جگر میں ہو اگر گرمی کا احساس
مربہ آملہ کھا یا انناس

اگر ہوتی ہے معدے میں گرانی
تو پی لے سونف یا ادرک کا پانی

تھکن سے ہوں اگر عضلات ڈھیلے
تو فوراً دودھ گرما گرم پی لے

جو دُکھتا ہو گلا نزلے کے مارے
تو کر نمکین پانی کے غرارے

اگر ہو درد سے دانتوں کے بیکل
تو انگلی سے مسوڑھوں پر نمک مل

جو طاقت میں کمی ہوتی ہو محسوس
تو مصری کی ڈلی ملتان کی چوس

شفا چاہے اگر کھانسی سے جلدی
تو پی لے دودھ میں تھوڑی سی ہلدی

اگر آنکھوں میں پڑ جاتے ہوں جالے
تو دکنی مرچ، گھی کے ساتھ کھا لے

تپ دق سے اگر چاہے رہائی
بدل پانی کے گنا چوس بھائی

دمہ میں یہ غذا بے شک ہے اچھی
کھٹائی چھوڑ، کھا دریا کی مچھی

اگر تجھ کو لگے جاڑے میں سردی
تو استعمال کر انڈے کی زردی

جو بد ہضمی میں چاہے تو افاقہ
تو دو اک وقت کا ہی کر لے فاقہ

بختی

طاہر مسعود

بختی کو گھر میں آئے ہوئے ابھی مہینہ بھر بھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ سب لوگوں میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ برسوں سے وہاں رہ رہی ہو۔ اس کے آنے سے سب ہی کو سہولت ہو گئی تھی۔ جسے بھی کوئی کام کرانا ہوتا وہ بختی ہی کو آواز دیتا۔

"بختی ایک گلاس پانی پلا دینا۔" مونی حکم چلاتی۔

"بختی اگر کپڑے خشک ہو گئے ہوں تو اتار لاؤ۔" امی کہتیں۔

"بختی ذرا میری موٹر سائیکل صاف کر دو۔" سہیل بھائی کمرے سے چیختے اور بختی بھاگ بھاگ کے سارے کام کر دیا کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتی رہتی تھی۔ رنگ تو اس کا توے کی طرح سیاہ تھا اور عمر بھی گیارہ بارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن باتیں بڑی سمجھ بوجھ کی کیا کرتی تھی۔ گھر میں یوں تو سب کا رویہ

اس سے اچھا تھا۔ لیکن روما کو وہ ذرا بھی پسند نہیں آئی تھی۔ پہلے ہی دن سے، جب بختی کی ماں اسے لے کر آئی تھی۔ روما اسی وقت اسکول سے آئی تھی اور اس نے دیکھا تھا ایک لڑکی دیوار سے پیٹھ ٹیکے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔ بلاوجہ، مسکرانے کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔ روما کو یہ مطمئن طبیعت کی لڑکی بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ اس نے منہ بنایا اور کمرے میں چلی گئی۔ بختی اسی لمحے بھانپ گئی تھی کہ روما کو وہ ناپسند ہوئی ہے۔ وہ اسی دن سے اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح روما کا دل جیت سکے۔ وہ منتظر رہتی تھی کہ روما اس سے کسی کام کے لئے کہے اور وہ جھٹ پٹ اس کے حکم کی تعمیل بجا لائے۔ لیکن روما کام کہنا تو درکنار اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن کیوں؟ یہ بات خود روما بھی نہیں جانتی تھی۔ البتہ گھر کے باقی لوگ بختی کے آنے سے بہت خوش تھے۔ اس نے سب کا بوجھ ہلکا جو کر دیا تھا۔

ایک دن جب روما اسکول سے آئی تو بختی ہی نے گیٹ کھولا۔ اس نے جلدی سے روما کا بستہ تھام لیا: "لائیے بی بی جی، آپ تھک گئی ہوں گی۔" اس نے شائستگی سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔" روما نے جھڑک دیا۔

بختی کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ اور واپس آکر اپنے کام میں مگن ہو گئی۔

ایک لحاظ سے اس نے روما کے حکم کی تعمیل ہی کی تھی۔ روما کو بعد میں تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن پھر اس نے سر کو جھٹکا اور اس بات کو بھلا دیا۔ لیکن بختی نے اس بات کو نہیں بھلایا تھا۔ وہ رات کو بستر پر لیٹی تو بار بار روما کا نفرت بھرا چہرہ ذہن میں ابھرتا رہا۔ آخر روما بی بی اس سے کیوں خفا رہتی ہیں؟ اس نے بہت سوچا لیکن وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت سی باتیں آدمی کی زندگی میں ایسی پیش آتی ہیں جن کو سمجھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ مثلاً روما کی نفرت۔ مثلاً اس کے باپ کا رویہ۔ باپ کا خیال آتے ہی بختی کی کنپٹی کی رگیں کھنچ گئیں۔ اسے اپنے باپ سے سخت نفرت تھی۔ وہ تھا بھی نفرت کے قابل۔ ایک انتہائی نکما آدمی جو سارا دن پلنگ پر پڑا سویا رہتا اور راتوں کو غائب رہتا تھا۔ اوباش قسم کے آدمیوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بختی کی ماں جب اسے کام پر جانے کے لئے کہتی تھی تو وہ اس سے جھگڑنے لگتا تھا۔ ماں پلٹ کر جواب دیتی تھی تو وہ اسے مارنے دوڑتا تھا۔ اس کے بال نوچتا تھا، اسے پیٹ ڈالتا تھا۔ بختی یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور کسی کونے میں منہ چھپائے سسکیاں بھرا کرتی تھی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ دیکھتی تھی کہ گھروں میں برتن مانجھ مانجھ کر ماں کی ہتھیلیوں میں چھالے پڑ گئے تھے اور ان چھالوں کے عوض اتنے پیسے مل جاتے تھے جس سے گھر کا گزارہ ہو جاتا تھا۔ ماں کے کمائے ہوئے پیسوں سے بختی کی تین چھوٹی بہنیں اور دو بھائی اور اس کا

باپ روٹیاں توڑا کرتے تھے۔ بختی سب سے بڑی تھی۔ یہ سارے واقعات دیکھ دیکھ کے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ماں کی مدد کرنی چاہئے۔ اسے خود بھی کہیں کام کرنا چاہئے۔ ماں بھی غالباً یہی چاہتی تھی اور یوں وہ قزلباش صاحب کے گھر میں ایک مستقل کام کرنے والی کی حیثیت سے آگئی تھی۔ جہاں بہت سارے لوگ رہتے تھے اور ان سب کو بختی جیسی ملازمہ کی ضرورت تھی جو ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ پھر سب لوگ مفلوج ہو جائیں اور ایک گلاس پانی پینے کے لئے بھی بختی کے محتاج ہو جائیں۔ سوائے روما کے، جو اپنے کام خود کرنا پسند کرتی تھی۔

○

قزلباش صاحب ایک کاروباری آدمی تھے اور عام طور پر بے حد مصروف رہتے تھے۔ رات کو دیر سے گھر آتے تھے۔ بختی ان کے آنے تک جاگتی رہتی تھی۔ گاڑی کا ہارن جیسے ہی بجتا وہ بھاگ کر گیٹ کھولتی۔ ان کے ہاتھوں سے بریف کیس لیتی۔ قزلباش صاحب کو اس کی یہ ادا بہت بھلی لگتی تھی۔ وہ ایسی توجہ اپنی بیوی اور بچوں سے چاہتے تھے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا احساس پہلی بار انہیں بختی ہی نے دلایا تھا کہ گھر میں ان کا استقبال اس طرح بھی کیا جاسکتا ہے۔

وہ تھکی ہوئی مسکراہٹ سے کہتے: "بختی! تو ابھی تک جاگ رہی ہے سوئی نہیں؟"

"آپ کا انتظار کر رہی تھی صاحب۔" وہ مسکرا کر کہتی۔

"اچھا اب تم جاؤ، سو جاؤ۔" وہ شفقت سے کہتے۔

لیکن وہ سوتی نہیں۔ وہ قزلباش صاحب کے آگے سلیپر رکھتی، ان کے جوتے اسی وقت صاف کر دیتی تاکہ صبح انہیں دیر نہ ہو۔ جب وہ منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے نکلتے تو وہ تولیہ لئے کھڑی رہتی۔ پھر جب تک وہ کھانے کی میز سے اٹھ نہیں جاتے وہ کچن کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی رہتی۔ صاحب کے حکم کی منتظر۔ یہ سارے کام وہ دل سے کرتی۔ یہ سوچ کر نہیں کہ وہ ملازمہ ہے اور اس کے اسے پیسے ملتے ہیں۔ وہ قزلباش صاحب کو سچ مچ اپنے باپ کے روپ میں دیکھتی تھی۔ باپ کے پیار سے محروم جو تھی۔ قزلباش صاحب جب شفقت سے اسے "بیٹی" کہہ کر مخاطب کرتے تو اس کے دل میں پیار امڈ آتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ قزلباش صاحب کے بازوؤں میں اپنا منہ چھپالے اور اتنا روئے، اتنا روئے کہ سارا غم ڈھل جائے۔

"صاحب! آپ اتنی دیر میں کیوں آتے ہیں؟" ایک دن اس نے پوچھا۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ قزلباش صاحب کی بیگم کو اس کا یہ پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے اسے گھورا۔ قزلباش صاحب اپنی دھن میں مگن تھے۔ بولے: "بیٹی کام بہت ہوتے ہیں نا۔ کاروبار ہے ہی ایسی چیز۔" کھانے کی میز سے

اٹھتے ہوئے قزلباش صاحب نے سوچا۔ یہ بات میرے اپنے بچوں نے تو آج تک نہیں پوچھی۔ انہوں نے تو اس کی کبھی پروا نہیں کی۔ اگر ان کی اپنے بچوں سے ہفتوں ملاقات نہیں ہوتی تو بھی وہ اس کا کبھی گلہ نہیں کرتے تھے۔ بچوں کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ یہی بہت تھا۔ قزلباش صاحب کو احساس ہوا کہ بختی نے اپنی بے لوث خدمت سے ان کے دل میں جگہ بنالی ہے۔ گھر کے معاملات برسوں سے ایک طے شدہ طریقے سے چل رہے تھے۔ سارا انتظام ان کی بیگم کے ہاتھوں میں تھا۔ انہیں صرف اپنے کاروبار سے غرض تھی۔ وہ گھر کے معاملوں میں دخل بھی نہیں دیتے تھے۔ بچے سب ماں سے قریب تھے۔ انہیں کبھی کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو ماں سے ہی کہتے تھے۔ قزلباش صاحب کی حیثیت تو گھر میں بس ایک سرپرست کی تھی۔ ایک کفالت کرنے والے کی۔ ان کا اپنی بیوی اور بچوں سے ویسا کوئی گہرا جذباتی تعلق نہیں تھا جس کا اظہار آئے دن کی چھوٹی موٹی باتوں میں ہوتا ہے۔ بچے بھی اس کے عادی ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے پاپا ایک بے حد مصروف آدمی ہیں جو صبح سویرے نکلتے ہیں اور رات گئے لوٹتے ہیں، جب وہ سب اپنے بستروں پر جا چکے ہوتے تھے۔

○

یوں تو بختی ہر ایک کا ہی خیال رکھتی تھی۔ وہ یں بھائی کے کمرے سے لے کر موٹر سائیکل تک کی صفائی کرتی۔ مونی کے کپڑے دھوتی اس کی کتابیں سلیقے سے رکھتی، کچن کے کاموں میں امی جان کا ہاتھ بٹاتی۔ سارے برتنوں کی دھلائی، سارے گھر کی صفائی ستھرائی، غرض کہ اس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ اس نے سب کو نکما بنا دیا تھا۔ سوائے روما کے جس کے لئے بختی کا گھر میں ہونا اور نہ ہونا برابر تھا۔ بختی کا مسئلہ روما تھی اور روما کا مسئلہ بختی۔ بختی کی الجھن یہ تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ گھر کے سب لوگ اس سے خوش رہیں۔ سب لوگ خوش بھی تھے مگر روما خوش نہیں تھی۔ وہ مزاجاً خوش باش لڑکی تھی بھی نہیں۔ زیادہ تر وہ خاموش رہتی۔ اور جب وہ خاموش ہوتی تو اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی اداسی تیرتی رہتی تھی۔ وہ پتہ نہیں کن خیالوں میں گم رہتی تھی۔ گھر میں ہوتی تو اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہوتی یا پھر لان میں کرسی ڈالے پھولوں پر اڑتی تتلیوں کو دیکھتی رہتی یا نیلے آسمان کو جہاں دور پرندے سلو موشن میں اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ بختی بغیر کچھ کہے روما کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتی رہتی تھی۔ روما کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہ کیا چاہتی تھی؟ یہ کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ امی کی طبیعت بھی اس کی ان عادتوں سے سخت الجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ دوسرے بچوں کی طرح روما بھی اپنے دل کی باتیں ان سے کہے، کسی چیز کی فرمائش کرے، اپنی کسی خواہش کا اظہار کرے۔ روئے، بگڑے، چیخے۔ آخر گھر میں سو طرح کی باتیں ہوتی تھیں جن پر وہ اپنے غصے کا اظہار کر سکتی تھی...... لیکن

روما تو نہ جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ البتہ بخشی کے آنے کے بعد انہیں اتنا اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ روما اسے پسند نہیں کرتی۔ لیکن اس کے سبب سے وہ بھی لاعلم تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز بخشی نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ روما سے بات کرے گی وہ صاف صاف لفظوں میں پوچھے گی کہ آخر وہ اس سے خفا کیوں رہتی ہے؟ اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں اتنی بیزاری کیوں آجاتی ہے؟ جب اس نے یہ تہیہ کر لیا تو اسے ذرا اطمینان ہو گیا۔ دل سے بہت سارا بوجھ ہٹ گیا۔ اتوار کی شام..... روما حسب عادت لان میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں انگریزی کی کوئی کتاب پڑی تھی جسے پڑھتے پڑھتے اس نے پلٹ کر رکھ دیا تھا اور خود کرسی سے سر ٹیکے نیلے آسمان کو دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے ابھی تھوڑی دیر میں آسمان پر کوئی بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ویسی ہی اداسی تیر رہی تھی اور اس کا زردی مائل چہرہ کچھ اور زرد نظر آرہا تھا۔ سیاہ رنگت اور چھوٹے سے قد کی بخشی نے اسی موقع کو غنیمت جانا۔ وہ ہلکے قدموں سے چلتی ہوئی قریب گئی۔

"بی بی! میں یہاں بیٹھ جاؤں۔" اس نے قریب جا کر روما سے کہا۔ روما نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بخشی کے چہرے پر ہمیشہ کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں حقارت ابھری۔ لیکن پھر اس نے سنبھل کر لاتعلقی سے کہا "بیٹھ جاؤ" اور پھر کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ بخشی تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ اس کی آج تک روما سے بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس نے ہمت جمع کی۔

"بی بی جی۔ ایک بات پوچھوں؟" اس نے کہا۔

روما نے اس کی طرف دیکھا۔ منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن انداز ایسا تھا جیسے وہ بخشی کی بات سننے کی منتظر ہے۔

"آپ کو مجھ پر غصہ ہے جی۔ آپ مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ کبھی کسی کام کے لئے بھی نہیں کہتیں۔ میرا کیا قصور ہے جی۔"

بخشی کے لہجے میں بڑی عاجزی تھی۔ روما کا دل پسیج گیا۔

نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنے کام خود کرنا پسند کرتی ہوں۔" روما نے آہستہ آواز میں کہا۔

"بی بی۔ مجھ کو لگتا ہے۔" بخشی کہتے کہتے جھجکی "میں آپ کو اچھی نہیں لگتی ہوں۔"

روما چپ رہی۔ یہ بات ٹھیک تھی۔ روما کو اس پر غصہ نہیں تھا۔ اصل میں بخشی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے دیکھا پہلی بار، جب سے بخشی آئی تھی پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ تب

ایک دم اس پر روشن ہو گیا کہ وہ بختی کو کیوں ناپسند کرتی ہے۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بختی....." روما نے کہا: "تم مسکراتی کیوں ہو؟ ہر وقت، ہمیشہ۔ مجھے تمہاری مسکراہٹ زہر لگتی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے وہاں سے چل دی۔ بختی حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

○

قزلباش صاحب رات کو گھر آئے تو ان کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ کھانے کے بعد انہوں نے بختی کو پیکٹ تھما کر کہا: "دیکھو بیٹی اس میں تمہاری کتابیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ذرا لکھنا پڑھنا بھی چاہئے۔ کوئی مشکل پیش آئے تو روما سے مدد لے لینا۔ میں اس سے کہہ بھی دوں گا۔" بختی جو اپنے اندر ایک غیر معمولی مسرت محسوس کر رہی تھی۔ روما کا نام آتے ہی اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ پچھلی شام کا سارا واقعہ ایک دم حافظے میں روشن ہو گیا۔ قزلباش صاحب نے اس کی بدلی ہوئی کیفیت کو بھانپ لیا۔

"کیا بات ہے بختی۔ کیا تم پڑھنا نہیں چاہتیں۔"

"نہیں صاحب، نہیں صاحب۔" بختی نے جلدی سے کہا۔

"اچھا تم آئندہ مجھے صاحب وغیرہ نہ کہا کرو۔ جیسے اور بچے پاپا کہتے ہیں۔ تم بھی کہہ سکتی ہو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر پاپا کمرے میں چلے گئے۔ قزلباش صاحب کی بیگم کمرے میں بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ سب کچھ بالکل اچھا نہیں لگا۔ ان کا خیال تھا کہ قزلباش صاحب کو اس معاملہ میں ان سے پہلے مشورہ کر لینا چاہئے تھا۔ آخر گھر کا انتظام ان کے ہاتھوں میں تھا۔ تو ان سے بالا ہی بالا یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بختی ایک ملازمہ تھی، اگر وہ بہت اچھا کام کرتی تھی تو اس کی تنخواہ میں پچیس پچاس روپے کا اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ آخر اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری تو ہماری نہیں تھی۔ اسے لکھانے پڑھانے کا مطلب تو اس کا دماغ خراب کرنا تھا۔ کل کلاں کو وہ اٹھ کر کہہ سکتی تھی میں کپڑے نہیں دھوتی، پونچا نہیں لگاتی، برتن صاف نہیں کرتی۔ پھر کیا ہو گا۔ اتنی مشکلوں سے ملنے والی ملازمہ کو یوں ضائع کر دینا کون سی سمجھ بوجھ کی بات تھی۔ بیگم قزلباش طبیعت کی بُری خاتون نہیں تھیں۔ وہ حقیقت پسند تھیں اور معاملات کو غیر جذباتی انداز میں حل کرنے کی قائل تھیں۔ لیکن ان کی حقیقت پسندی اتنی بے رحم نہیں تھی کہ وہ بختی کے ہاتھوں سے کتابوں کا پیکٹ چھین کر پھینک دیتیں ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا۔ اب اس

معاملے کو اسی وقت ٹھیک کیا جانا چاہئے جب یہ ہاتھ سے نکلتا محسوس ہو گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنا موڈ تبدیل کر لیا۔

○

اب اس گھر میں بختی کی ایک نئی آزمائش شروع ہوئی۔ ایک بے حد کڑی آزمائش وہ عادتاً مسکراتی تھی اور روما کو مسکراہٹ زہر لگتی تھی۔ اس لئے روما پر جیسے ہی اس کی نظر پڑتی اس کی مسکراہٹ غائب ہو جاتی۔ وہ ہراساں ہو جاتی۔ وہ پڑھنے بیٹھتی تو بیگم قزلباش اسے فوراً کسی کام کے بہانے اٹھا دیتیں۔ وہ جلدی ہی سمجھ گئی کہ بیگم صاحبہ کو اس کا پڑھنا پسند نہیں ہے۔ لہٰذا جب بھی وہ کتاب کھولتی ایک خوف سا اسے گھیرے رہتا کہ کہیں بیگم صاحبہ نہ آ جائیں۔ پھر ایک اور مسئلہ یہ بھی آ پڑا کہ بختی سے کام کرانے کے معاملہ میں بھائی بہنوں میں ایک رسہ کشی شروع ہو گئی۔

مونی کہتی: "بختی! میرے باتھ روم کا پانی نکال دو۔"

ٹھیک اسی وقت سہیل بھائی چیختے: "بختی! پہلے میرے کپڑے استری کرنا ہے۔" اور بختی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پہلے کون سا اور کس کا کام کرے۔ وہ سب کے کام کرنا چاہتی تھی وہ تو سب کو خوش رکھنا چاہتی تھی لیکن ظاہر ہے اس کے ہزاروں ہاتھ تو تھے نہیں۔ اسے اللہ نے دو ہی ہاتھ دیئے تھے۔ ان سے وہ ایک وقت میں جتنے کام لے سکتی تھی، لیتی تھی۔ اصل میں مسئلہ یہ نہیں تھا کہ مونی اور سہیل بھائی کو ایک ہی وقت میں بختی سے اچانک کام پڑ جاتے تھے بلکہ بات ساری یہ تھی کہ وہ دونوں بختی کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے تھے اور ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ بختی بس انہی کا کام کرے۔ اس پر دونوں بھائی بہنوں کے درمیان کئی بار بحث و تکرار بھی ہو چکی تھی۔ بختی کی شخصیت کئی حصوں میں بٹ چکی تھی۔ گھر میں سب کی توقعات بختی سے الگ الگ تھیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ سب کی توقعات پر کس طرح پوری اترے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گھر کی فضا میں تلخی آ گئی۔ بختی اب چپ چپ رہنے لگی تھی وہ اب بھی اسی طرح جی لگا کر کام کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کے کام میں وہ پہلے جیسی گرمجوشی باقی نہیں رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور انہوں نے یہی سمجھا کہ یہ سب ان کتابوں کا کیا دھرا ہے جو قزلباش صاحب نے لا کر اسے تھمائی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب گھر میں بختی رہے گی تو صرف ایک ملازمہ کی حیثیت میں۔ کتابوں کے چونچلے اسے چھوڑنے پڑیں گے۔ لیکن انہیں بختی سے یہ بات کہنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اگلے روز آسمان پر بادل گھر آئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بختی لان سے کپڑے اور دوسری چیزیں ہٹانے میں بُری طرح بھیگ گئی۔ رات تک وہ بخار میں جلنے لگی۔ چھوٹا سا نوکر روم سے نکال کر بختی کا کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں بستر پر بختی تکیے میں منہ لپیٹے پڑی تھی، اس کی

سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ بیگم صاحبہ اسے کسی کام کے لئے کہنے آئیں تو بختی کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ باہر بارش تیز ہو چکی تھی اور ایسے میں کسی ڈاکٹر کا بلانا بھی ممکن نہ تھا۔ قزلباش صاحب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر سہیل کے مشورے سے انہوں نے بختی کو بخار کم کرنے والی دوا دے دی۔ تھوڑی دیر میں اسے پسینہ آیا اور بخار کا زور ٹوٹ گیا۔ بیگم قزلباش کو اطمینان ہو گیا۔ بختی کو بخار ہے، یہ بات سب کو معلوم ہو گئی تھی۔ سبھی باری باری اسے دیکھنے آئے۔ لیکن نہیں آئی تو روما۔ وہ اپنے کمرے میں اسی لاتعلقی سے بیٹھی پڑھتی رہی۔ رات گئے قزلباش صاحب آئے تو انہوں نے بھی بختی کو دیکھا اور سہیل کو ہدایت کی کہ وہ صبح اسے ڈاکٹر کو دکھا لائے۔

رات تقریباً ڈیڑھ دو بجے بختی کو پھر سردی لگی اور زوروں کا بخار آ گیا۔ وہ نیند میں جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، دروازے پر کوئی سایہ سا لرز رہا ہے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ ڈر گئی..... وہ چیخنا چاہتی تھی۔ لیکن آواز اس کی حلق سے نہ نکلی۔ سایہ اس کی جانب بڑھا۔ پھر اس کے سرہانے بیٹھ گیا پھر سائے نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھ دیا۔

"کیسی ہو بختی"

آواز بختی کو جانی پہچانی سی لگی۔ وہ چپ رہی۔

"مجھ سے ناراض ہو؟" روما نے سرگوشیوں میں پوچھا بختی نے انکار میں سر ہلایا۔

"تو پھر مجھے دیکھ کر مسکراتی کیوں نہیں؟"

"آپ ہی نے تو منع کیا تھا بی بی۔" بختی نے رک رک کر جواب دیا۔

"تم مسکرایا کرو بختی۔ جو لوگ مسکراتے نہیں ہیں وہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔" روما نے کہا اور اس کی پلکوں سے آنسو بہہ نکلے۔

پہلا دوست میرے والد گنگا میں چھلانگ لگاتے ہیں اور جمنا میں سے نکلتے ہیں۔

دوسرا دوست :۔ اور میرے والد دریائے سندھ میں چھلانگ لگاتے ہیں اور دریائے چناب سے نکلتے ہیں۔

تیسرا دوست :۔ یار یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ میرے والد تو ڈنکی میں چھلانگ لگاتے ہیں اور نل سے نکلتے ہیں۔

عارف بیگ ..... پنجرہ پول

ساجد سعید

غریب کیڑے عجیب کارنامے

اس وسیع و عریض دنیا میں خدا کی کچھ مخلوقات ایسی بھی ہیں جن کے متعلق شاید ہی ہم نے کبھی غور کیا ہو۔ یہ سمندر کی وسعتوں سے لے کر فضاء کی بلندیوں تک کروڑوں کی تعداد میں اس کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے حشرات الارض ہیں جو ہمارے گھروں کے باغیچوں میں بھی نظر آئیں گے اور بعض کو تو صرف خوردبین کی مدد سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ حشرات کا چلنا، پھرنا، رہن سہن اور غذا حاصل کرنے کا طریقہ بڑا دلچسپ ہے۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جو میلوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر لیتے

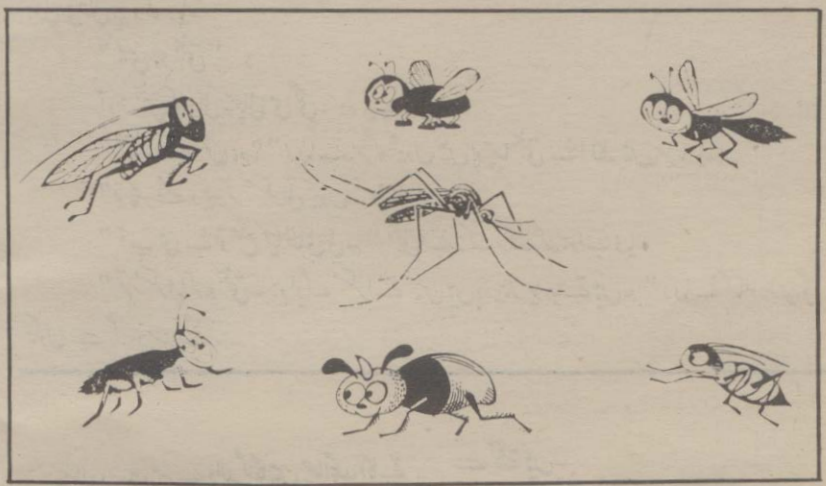

ہیں اور بعض چند فٹ کا فاصلہ طے کرنے میں مہینوں لگا دیتے ہیں۔ مثلاً کیچوے کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو زیر زمین سرنگیں بنا کر سفر کرتی ہے۔ یہ سرنگیں ننھی منی اور لمبی لمبی لکیروں جیسی ہوتی ہیں۔ سرنگیں بنانے والا ایک اور بھی جانور ہے جسے ہم "چھچھوندر" کہتے ہیں۔ اس کو قدرت نے نوکیلے دانت اور مضبوط پنجے عطا کئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے زمین کھود کر سرنگیں بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس کے برعکس کیچوے کے لئے سرنگیں بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ کیچوے کی ٹانگیں تو سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ البتہ قدرت نے اس کے پیٹ کے نیچے سخت اور مضبوط بال پیدا کر دیئے ہیں جن کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے جس کی مدد سے کیچوا رینگتا ہے۔

اب آیئے ذرا ننھی منی لیکن سمجھ دار اور چالاک مکڑیوں کی طرف۔ اُن کی حرکات کے طریقے بھی بڑے عجیب و غریب ہیں۔ یہ لمبے لمبے پل بناتی ہیں۔ درخت کی شاخوں کے درمیان یہ آنے جانے کا کام دیتے ہیں۔ یہ پل انسانوں کو نظر نہیں آتے کیونکہ یہ بہت باریک تعمیر کئے ہوتے ہیں جب سخت گرمی کے موسم میں مکڑیوں کو گھبراہٹ ہو جاتی ہے تو وہ نہایت چالاکی اور منظم طریقے سے یہ جالا بنتی ہیں۔ جو نہایت ہلکا اور خوبصورت ہوتا ہے اور جب ہوا کا کوئی جھونکا جالے کی طرف آتا ہے تو وہ اپنی جگہ سے الگ ہو کر ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ بحری اور ہوائی جہازوں میں اکثر مکڑیوں کے جالے پائے گئے ہیں جو فضاء میں ہوائی جہازوں سے چمٹ گئے یا بادبانوں سے نیچے آنے کے بعد بحری جہازوں کو اپنا مسکن بنالیا۔

لاطینی امریکہ میں ایک کیڑا پایا جاتا ہے جس "ریل روڈ وارم" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ کیڑے زیر زمین پائے جاتے ہیں اور سال کے چند خاص مہینوں میں یہ ریت کے اوپر آتے ہیں۔ ان کا تعلق جگنو کے خاندان سے ہے۔ جب یہ کیڑا رات کی تاریکی میں اپنے گھر سے باہر آتا ہے تو اس کے جسم کے پہلوؤں سے گیارہ گیارہ سبزی مائل زرد نقطے روشن ہو جاتے ہیں اور سر سے سرخ روشنی پھوٹنے لگتی ہے۔ وہاں کے مقامی لوگ اسے "اللہ میاں کی ریل گاڑی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب یہ رینگتا ہے تو فی الواقع کسی چھوٹی ریل گاڑی کا گمان ہوتا ہے۔

سانپوں کی ایک زہریلی قسم "سبزہ" بھی ہے۔ ان میں بلا کی پھرتی ہوتی ہے یہ جب چاہیں ایک درخت سے دوسرے درخت آناً فاناً میلوں دور نکل جاتے ہیں۔

چمک دار اور چکنی کھال والے گھونگھے رات کی تاریکی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔ تاکہ پرندوں کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں۔ جب یہ زیر زمین چلتے ہیں تو ان کے منہ سے لیس دار مادے کی ایک پٹی خارج ہوتی ہے۔ اگر آپ اس کے جسم کو کسی تیز بلیڈ پر بھی گزاریں تو یہ وہاں سے بھی با آسانی گزر جائے گا۔ کیونکہ اس کے جسم کا لیس دار مادہ اس کو بلیڈ سے محفوظ رکھتا ہے۔ گھونگھے کی رفتار ایک گھنٹے میں دس فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ اپنے سفر کے لئے سڑکیں بھی بناتا ہے۔ صبح کی روشنی میں آپ نے کبھی اپنے باغیچے میں چمک دار لمبی لمبی سفید لکیریں دیکھی ہوں گی۔ جی ہاں یہ گھونگھے میاں کا کمال ہے یہ انہوں نے اپنے لیس دار مادے (جو ان کے جسم کے غدود دوں میں تیار ہوتا ہے) کی مدد سے بنائی ہیں۔

ندی نالوں میں پائے جانے والی ایک مکھی جسے "سیاہ مکھی" کے نام سے پکارا جاتا ہے میں عجیب و غریب صلاحیت ہے جب یہ انڈے سے باہر نکلتی ہے تو اس کے چاروں طرف پانی کے بلبلے کا ایک خول بن جاتا ہے اور یہ اس وقت تک نہیں پھٹتا جب تک یہ پانی میں رہتا ہے اور جب یہ پانی کے سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو اس وقت اس سیاہ مکھی کے پر نکل آتے ہیں اور یہ بالغ ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ بلبلا پھٹ جاتا ہے اور سیاہ مکھی آزاد ہو کر فضاء میں اڑ جاتی ہے۔

یوں تو دنیا میں فن تعمیر کے شعبے نے بہت ترقی کر لی ہے لیکن شہد کی مکھیوں کا چھتہ فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ شہد کی مکھیوں کا گھر مسدس کی مانند ہوتا ہے۔ یہ موسم کا اندازہ بھی بڑے کمال سے کرتی ہیں یہ اپنے چھتوں میں ننھے منے سوراخ بناتی ہیں تاکہ چھتہ اندر سے ٹھنڈا رہے اور چھتے کے باہر بھی بہت سی مکھیاں بھنبھناتی رہیں تاکہ چھتہ اندر اور باہر سے ٹھنڈا رہے۔ زیادہ گرمی ہونے کی صورت میں شہد کی مکھیاں چھتے کے اندر پانی پہنچاتی رہتی ہیں اس طرح چھتے کے اندر کا درجۂ حرارت نارمل رہتا ہے۔

کیڑے بھی قدرت کا عجیب کرشمہ ہیں، جن کی ہماری دنیا میں پانچ لاکھ سے زیادہ اقسام ہیں۔ ہر کیڑے کی منہ کی بناوٹ مختلف ہوتی ہے ان کے دھڑ کے تین حصے ہوتے ہیں۔ بعض کیڑے انسانوں کے لئے مفید ہیں مثلاً شہد کی مکھیوں سے ہزاروں من موم حاصل ہوتا ہے۔ ریشم کے کیڑے ریشم پیدا کرتے ہیں اسی طرح ہماری اس دنیا میں حشرات الارض کی ایسی لاکھوں اقسام موجود ہیں جنہوں نے اس دنیا کو اپنے اچھوتے کرشموں سے عجیب بنا دیا ہے۔

فینسی ڈریس شو کے لئے مسٹر سام نے کتّے کا بہروپ بھر رکھا تھا۔ وہ بالکل کتّا دکھائی دے رہے تھے۔ راستے میں آوارہ کتّے پکڑنے والے ایک سیاہ فام نے انہیں دبوچ لیا اور گھسیٹ کر بلدیہ کے ٹرک کی طرف لے جانے لگا۔ "میں کتّا نہیں ہوں" مسٹر سام چلائے "میں نے فینسی ڈریس شو کے لئے یہ روپ دھارا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" کتّے پکڑنے والے نے کہا "میں نے صبح سے اب تک بارہ کتّے پکڑے ہیں۔ ہر کتّے نے اسی قسم کی بات کی تھی۔"

ثاقب ندیم احمد ..... کراچی

منشی جی کی کار

محمد انوار احمد

منشی جی نے کار جو لے لی
گویا مول مصیبت لے لی

گھر تک تو وہ چل کر آئی
اس کے بعد نہ چلنے پائی

بچّے بھی بلوائے انھوں نے
دھکّے بھی لگوائے انھوں نے

لیکن بس اتنا چل پائی
دھکّوں سے جتنا سرکائی

لاکھ اس کو سمجھایا انہوں نے
چُمکارا پھُسلایا انہوں نے

لیکن اس کو عقل نہ آئی
ٹس سے مَس وہ ہو نہ پائی

مستری اِک آخر بلوایا
انجن پورا پھر کھلوایا

ہر ہر چیز نئی ڈلوائی
پونجی اپنی اور گنوائی

پیسے اس پر بہت لگائے
شاید ایسے ہی چل جائے

لیکن ہرگز چل نہ پائی
جان مصیبت میں ہی آئی

آخر یہ تدبیر نکالی
بلوا کر اک لائے کباڑی

اونی پونی قیمت پائی
لے کر اپنی جان چھڑائی

اب سوچا ہے کار نہ لیں گے
چاہے پیدل ہی گھسٹیں گے

جانا تو ہوگا ہی بھائی
کار وہ کیا جو کام نہ آئی

اس ماہ آپ کو آنکھ مچولی کیسا لگا

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ
آنکھ مچولی کو معیاری تحریروں کے حسن سے
آراستہ کر کے آپ تک پہنچائیں
تاہم آپ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا
اور آپ کی آراء کی روشنی میں آنکھ مچولی کو خوب سے خوب تر بنانا ہی ہمارا مقصد
ہے
اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہماری مدد کیجئے
ہمیں بتائیے کہ..... اس ماہ آپ کو
..... آنکھ مچولی میں سب سے بہترین تحریر کون سی لگی ؟
..... آپ کے خیال میں کمزور ترین تحریر کون سی تھی
تمام تحریروں کو پسندیدگی کے اعتبار سے ترتیب دیجئے
اور ہمیں لکھ بھیجئے..... آپ کی رائے..... آنکھ مچولی
کے معیار میں بہتری کی سمت ہماری معاون ہوگی

یہ بھولے بھالے لوگ

سید ذاکر حسین چشتی

چھٹیاں کسے اچھی نہیں لگتیں، میں بھی انہی میں شامل ہوں جنہیں چھٹیاں بہت اچھی لگتیں ہیں۔ لہٰذا جیسے ہی اسکول کی چھٹیاں ہوئیں میں بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس دفعہ میرا ارادہ نوشہرہ کے قریب ایک گاؤں میں خالہ کے گھر جانے کا تھا۔ جامیں اکیلا رہا تھا اس لئے مسئلہ گھر سے اجازت حاصل کرنے کا تھا جو تھوڑی بہت کوشش کے بعد مل گئی۔ سیٹ کی بکنگ کرالی گئی اور پھر انتظار کی گھڑیاں شروع ہو گئیں۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا جب مجھے ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ ابو نے ٹکٹ جیب میں اور ڈھیر ساری نصیحتیں دماغ میں ٹھونس دیں اور پھر الوداع کیا۔

کراچی سے نوشہرہ کا سفر کافی لمبا بھی ہے اور صبر آزما بھی لیکن جانے کی خوشی اتنی تھی کہ یہ سفر تھوڑا

لگا۔ جب گاڑی اسٹیشن پر لگی تو فوراً ہی میرے کزن کی شکل دکھائی دی، جو ڈبوں میں مجھے جھانکتے پھر رہے تھے۔ میں نے انہیں پکڑا اور بغل گیر ہو گیا۔ انہوں نے میرا سامان اٹھایا اور اسٹیشن سے باہر آ گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم بس میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ گو کہ بس کا سفر بھی کئی گھنٹوں پر محیط تھا مگر میرے کزن کی دلچسپ باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلا اور پھر جب ہم گاؤں پہنچ کر گھر میں داخل ہوئے تو وہاں سب استقبال کرنے کے لئے کھڑے تھے۔

گاؤں کی زندگی اور شہر کی زندگی میں بڑا فرق ہے، خصوصاً ایسے گاؤں جو چھوٹے شہروں سے بھی دور ہیں، جو سہولتیں ہمیں شہر میں میسر ہیں وہ گاؤں میں کہاں۔ اس بات کا اندازہ اس طرح ہوا کہ جب خالہ صبح ہی صبح مٹکے اٹھا کر پانی لینے گئیں تو ان کی واپسی دو گھنٹے سے پہلے نہ ہوئی۔ تب پتہ چلا کہ یہاں سے تقریباً ۷ کلو میٹر دور پانی کی ایک چھپڑی ہے جہاں سے پانی لے کر آتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو یہ چھپڑی بھر جاتی ہے اور پھر آئندہ بارش تک اسی پانی کا استعمال کفایت شعاری سے ہوتا ہے۔ دو باتیں اور جو میں نے گاؤں میں رہ کر دیکھیں وہ یہ کہ یہاں پر ڈاکٹر نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، البتہ وہ گاؤں خوش نصیب ہوتا ہے جہاں کمپونڈر وغیرہ ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگوں کے عقیدے کمزور ہوتے ہیں یہاں جعلی پیروں، فقیروں کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے اور اپنا علاج معالجہ بھی انہی کے نسخوں سے کیا جاتا ہے۔

اتنی لمبی تمہید باندھنے کا مقصد آپ کو ایک واقعہ سنانا ہے جو میرے سامنے پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ہماری خالہ کی پڑوسن کی لڑکی کی طبیعت خراب تھی۔ خالہ جب اس کی عیادت کو جانے لگیں تو میں نے بھی ان کے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے جواب دیا یہ تو اچھی بات ہے کسی بیمار کی عیادت کرنا، تم بھی چلو۔ خیر میں بھی ان کے ہمراہ پڑوسن کے گھر پہنچا۔ ان کی لڑکی جس کا نام ودوحا ہے اس وقت ہائے ہائے کر رہی تھی۔ اس کے پیٹ میں شدید تکلیف معلوم ہوتی تھی۔ خالہ نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ یہ شہر نہیں کہ تم مشورہ دو کہ پیر صاحب کا علاج چھوڑ کر ڈاکٹر کا علاج کروائیں۔ یہ لڑکی ذات ہے اس لئے اگر لڑکی مر بھی جائے تو اس کو ڈاکٹر کے پاس لے کر نہ جائیں۔ اس لئے میں چپ چاپ بیٹھا ودوحا کو تکلیف میں تڑپتے دیکھتا رہا۔ ابھی ہم بس بیٹھے ہی تھے کہ ایک افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ محلے میں ایک بزرگ کا انتقال ہو گیا ہے سب نے با آواز بلند اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

اتنے میں ودوحا نے آنکھیں کھولیں اور نحیف سی آواز میں پانی مانگا۔ مگر ان کی والدہ نے سنی ان سنی کر دی اور اٹھ کر مٹکے کا سارا پانی بہا دیا۔ میں نے پڑوسن آنٹی سے پوچھا، آنٹی آپ نے پانی کو کیوں

بہا دیا، توانہوں نے بتایا کہ بیٹا یہ یہاں کی روایت ہے کہ اگر محلے میں کوئی فوت ہو جائے تو سارے محلے والے اپنا اپنا سارا پانی لڑھکا دیتے ہیں کیونکہ کہتے ہیں کہ اس پانی کو پینے والا بھی فوراً ہی مرجاتا ہے۔ ہمارے ایک محلے والے نے اس کو نہیں مانا تھا اور اس نے پانی پی لیا تو وہ بھی فوراً مر گیا۔ لہٰذا اب تازہ پانی لاکر ہی اس کو پلاؤں گی تو میں نے کہا کہ "آنٹی پانی لانے میں دو ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔" توانہوں نے کندھے اچکائے تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولیں۔ اتنے میں خالہ نے مجھ سے کہا "بیٹا ذرا گھر جاکر مٹکے کا پانی پھینک دو۔ میں نے اثبات میں سرہلایا اور گھر کی طرف چلا۔

گھر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ میرے بیگ میں درد دور کرنے والیاں گولیاں وافر مقدار میں موجود ہیں جو ابو نے احتیاطاً بیگ میں رکھ دیں تھیں، لیکن میں گولیاں کھلاؤں گا کس طرح پانی تو ہے ہی نہیں۔ مطلب یہ پانی تو پلایا نہیں جاسکتا۔" پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور میں اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور دوبارہ پڑوسن کے ہاں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے کہا "آنٹی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں کہ میں ودوحا کا علاج کروں" تو آنٹی نے ہنس کر کہا "بیٹا تم کس طرح علاج کروگے، میں نے کہا آنٹی میرے پاس چند گولیاں موجود ہیں میں ودوحا کو کھلاؤں گا تو یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ آنٹی نے کہا "مگر یہ گولیاں کس طرح کھلاؤ گے جب تک پانی لے کر کوئی نہیں آجاتا کیونکہ اگر گھر میں پانی موجود بھی ہے تو یہ پانی پلانے سے رہے کیونکہ پانی پینے والا فوراً مر جاتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے آنٹی اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دیں اور خالہ ان کے پیچھے پیچھے۔

آدھے گھنٹے بعد جب آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں تو ودوحا کی تکلیف کافی حد تک کم ہوچکی تھی اور ایک گھنٹے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنٹی نے حیرت سے اس سے پوچھا "ارے تم تو تھوڑی دیر پہلے ہائے ہائے کر رہی تھیں اور اب اٹھ بیٹھی ہو یقیناً یہ پیر صاحب کے تعویز کا کمال ہے۔"

"جی نہیں یہ تعویز کا کمال نہیں اگر تعویز سے آرام آنا ہوتا تو مجھے ٹھیک ہونے میں اتنے دن کیوں لگتے۔" ودوحا نے کہا "یہ تو ہمارے مہمان کا کمال ہے جو گولیاں انہوں نے کھلائیں اور اس سے فوراً آرام ہوگیا۔"

آنٹی نے فوراً پوچھا "لیکن پانی کون لے کر آیا تھا؟" میں نے جواب دیا "آنٹی میں نے گھر کا پانی پھینکنے سے پہلے ایک گلاس پانی کا بھرلیا تھا وہی گلاس ودوحا کو گولیوں کے ساتھ پلا دیا۔"

"کیا"؟ آنٹی نے قہر آمیز لہجے میں کہا۔ پہلے میری طرف دیکھا اور پھر ہشاش بشاش ودوحا کو دیکھنے لگیں۔

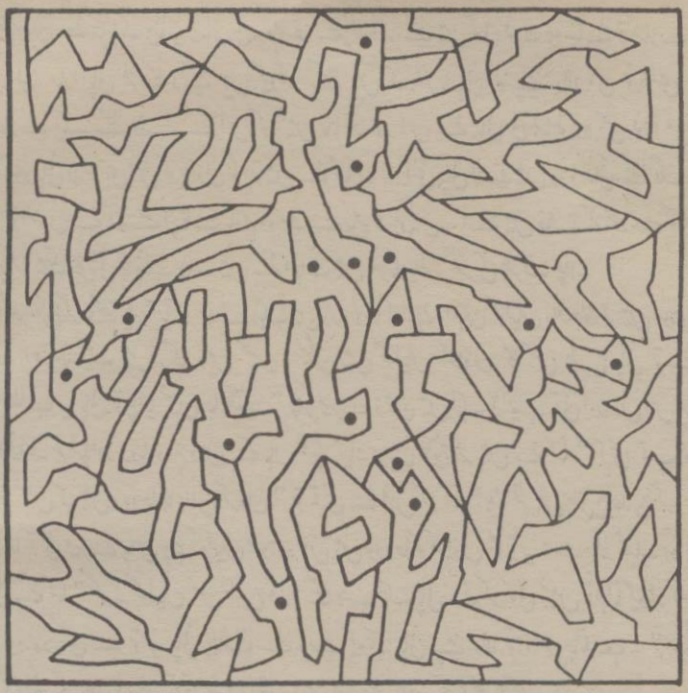

نقطوں والے حصّے میں رنگ بھریں اور مسکرائیں

صرف ایک تیلی ہلا کر سوال درست کریں

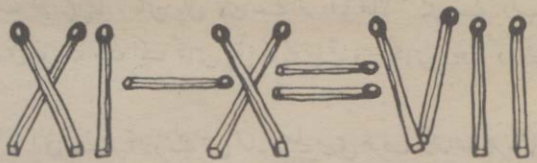

اگرچہ خاک تک اس ملک کی سُرمہ ہے آنکھوں کا
مجھے، لیکن وطن کی یہ ادا بے حد پسند آئی

آنکھ مچولی کے مقابلۂ مصوری میں یکساں
نوعیت کے انعام حاصل کرنے والی منتخب تصویریں

تفصیل صفحہ نمبر ۱۳۵ پر دیکھیں

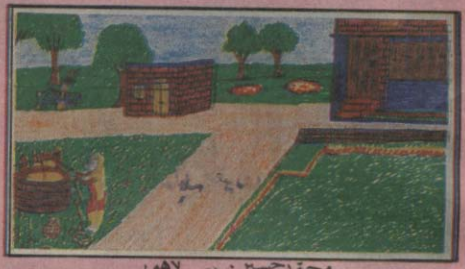

محمد حسین - لاہور

الماس بہیار علی - کراچی

رانی سیتا سندس - کراچی

عزیز - کراچی

زینب اختر بٹ - دوحہ قطر

دانیہ جبار - کراچی

فاروق احمد پیر زادہ - پاکپتن شریف

شہزاد علی شاہ - سیالکوٹ

ہو کے بھی دیکھیں ذرا بے ہڈیاں بے پسلیاں
کیسے کیسے کام دکھلاتی ہیں یہ کٹھ پتلیاں

سلمیٰ سلیم

احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ ان کے اشاروں پر ناچیں تاکہ ان کی بیمار ذہنیت کو تسکین مل سکے۔ ہٹلر، مسولینی، اسٹالن اور اسی طرح کے بڑے بڑے حکمران اسی احساس کمتری کے نمائندے تھے۔

شوق کوڑے دان تک بھی لے گیا

کٹھ پتلیوں کی حقیقت

گانے کے موڈ میں

اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو اپنے اطراف میں ایسے بے شمار لوگ مل جائیں گے جو دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں ایسے لوگوں کے اشاروں پر ناچنے والوں کو کٹھ پتلی کہا جاتا ہے۔

ہمیں درست طور پر تو معلوم نہیں کہ دنیا کی پہلی کٹھ پتلی کیوں بنی تھی؟ مگر خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق کسی ایسے ہی احساس کا نتیجہ ہوگی تاہم اس وقت دنیا بھر میں کٹھ پتلیوں کا استعمال بچوں اور بڑوں دونوں کا دل بہلانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کٹھ پتلیوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ کٹھ پتلیوں کے بعض کردار زندہ انسانوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے صرف کٹھ پتلی گھروں ہی میں نہیں دکھائے جاتے، بلکہ کٹھ پتلیوں کے مختلف کرداروں پر ٹی وی پروگرام بھی بنائے جاتے ہیں کٹھ پتلی کے ایک کردار کے وجود میں آنے کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے آیئے ہم آپ کو سنائیں۔

جم ہین سن اٹھارہ برس کا تھا کہ ایک روز اس نے اپنی امی کا بڑا کوٹ قینچی سے کاٹ

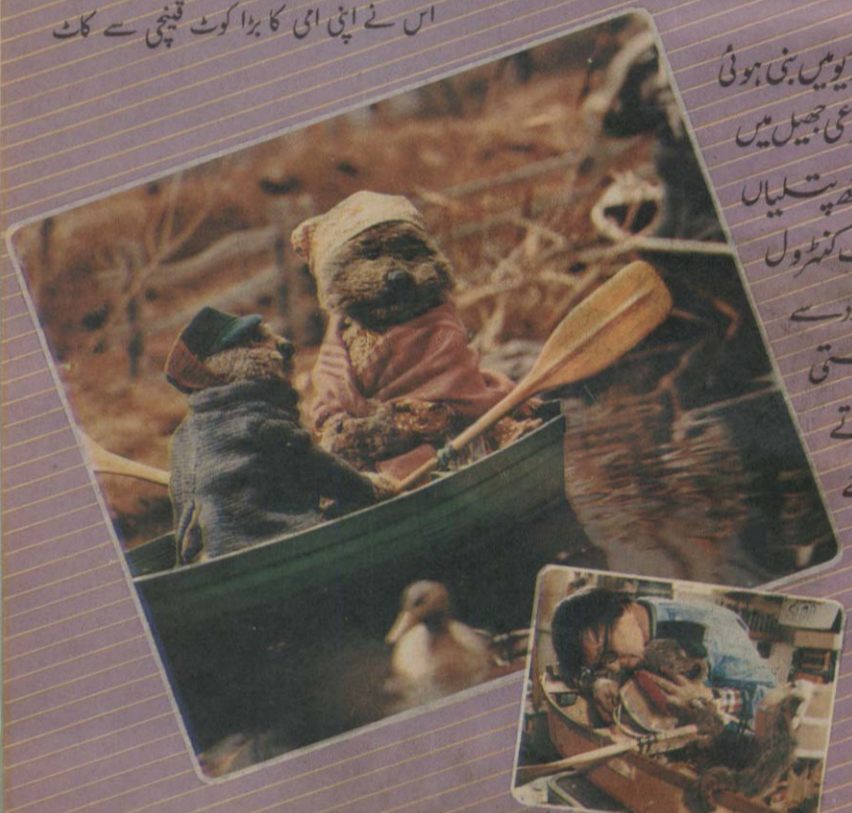

اسٹوڈیو میں بنی ہوئی مصنوعی جھیل میں دو کٹھ پتلیاں ریموٹ کنٹرول کی مدد سے کشتی کو چلاتے ہوئے

ڈالا۔ پھر اس نے کوٹ کے مختلف ٹکڑوں کو آپس میں سی کر پنگ پانگ بال کے دو حصوں کو ان کے ساتھ چسپاں کر دیا پھر جوں ہی اس نے اپنا ایک ہاتھ کوٹ میں ڈالا کرمٹ نام کا مشہور زمانہ مینڈک پپٹ وجود میں آگیا۔

اس وقت سے لے کر اب تک ہین سن اور اس کے ساتھیوں نے ۳۰۰ کے قریب پپٹ تیار کئے ہیں۔ سی سیم نام کا جو مشہور پروگرام آج کا ہمارے یہاں دکھایا جارہا ہے اس کے دو مشہور کردار "مس پگی" اور "بگ برڈ" انہی حضرات کے بنائے ہوئے ہیں۔

کٹھ پتلیاں بنانا بڑا مشکل کام ہے۔ جب کوئی نیا کردار تخلیق کرنا ہوتا ہے تو اس کا ڈیزائنر، کردار لکھنے والا اور کردار کو ہینڈل کرنے والا تینوں جمع ہوتے ہیں اور کردار کی تخلیق کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اپنے اپنے مشورے دیتے ہیں اس عمل کے دوران مہینوں لگ جاتے ہیں۔ عام طور پر ایک کردار کی کئی کاپیاں تیار کی جاتی ہیں تاکہ اگر ایک کاپی کو کچھ ہو جائے تو کام رکے نہیں۔

کٹھ پتلیاں امریکہ کے شہر نیویارک میں بنائی جاتی ہیں لیکن "پپٹ شو" لندن کے قریب فلمایا جاتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے کٹھ پتلیوں کے مختلف کردار نیویارک سے ہوائی جہاز کے ذریعے لندن جاتے ہیں۔

کیمرے کے سامنے آنے سے پہلے میرا میک اپ دیکھئے

ہوں کیمرے کے سامنے پُراعتماد میں

عام طور پر کٹھ پتلیاں زمین سے چھ فٹ بلند اسٹیج پر اپنا تماشہ دکھاتی ہیں ان پتلیوں کو بنانے والے اسٹیج کے نیچے کھڑے رہتے ہیں اسٹیج میں بڑے بڑے سوراخ ہوتے ہیں ان سوراخوں کے ذریعے کٹھ پتلیوں کے بنانے والے اپنے اپنے کرداروں کو ہینڈل کرتے ہیں۔

کٹھ پتلیوں کے خالق مائیکروفون میں بولتے ہیں مگر حاظرین کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کٹھ پتلیاں خود بول رہی ہوں۔ کٹھ پتلیوں کے مختلف کرداروں کو ہینڈل کرنے والے حضرات کے پاس ٹی وی سیٹ رکھے ہوتے ہیں جن پر کٹھ پتلیوں کو دیکھ کر وہ اندازہ کرتے ہیں کہ حاظرین یا ناظرین کو کٹھ پتلیاں کیسی دکھائی دے رہی ہیں۔

بے جان کٹھ پتلیوں کو نچا کر دل بہلانا تو ٹھیک ہے مگر زندہ انسانوں کو اپنے اشاروں پر نچانا ایک غیر انسانی فعل ہے خاص طور پر مسلمانوں کے لئے تو یہ بدترین بات ہے کیونکہ مسلمان صرف خدا اور اس کے رسول ؐ کے اشاروں پر چلنے کے پابند ہیں۔ انسانوں کے اشاروں پر چلنے کے نہیں۔ کیا ہم نے غلط کہا۔ ؟

میں نے بھارت میں کیا دیکھا

نیاز احمد مدنی

اپنے کزن کی شادی میں شرکت کے لئے ہمیں ہندوستان جانا پڑا تو گیارہ افراد پر مشتمل ایک مختصر سا قافلہ بذریعہ تیز گام لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ ہمارے قافلہ میں چھ بڑے اور پانچ بچے شامل تھے۔ نانی اماں اکثر ہمیں ہجرت کے واقعات سُناتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے ہمیں بھارت دیکھنے اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ لاہور سے سمجھوتہ ایکسپریس کے ذریعے ہم بھارت کے سرحدی اسٹیشن اٹاری پہنچے۔ بھارت میں جس چیز نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہاں کی غربت اور افلاس تھا۔ بھوکے ننگے بچے اور کمزور جسم کے جوان اور بوڑھے اور عورتیں معمولی کپڑوں میں ملبوس ہر طرف نظر آتی تھیں۔ اسٹیشن پر ایک مصیبت وہاں کے آوارہ کتے تھے جو بے جھجک لوگوں سے کھانا جھپیٹ کر لے جاتے تھے۔ ایک انجانی سی تحریر اور زبان ہر جانب دکھائی اور سنائی دیتی تھی۔ ماموں جان ٹکٹ لے آئے تو ہم آگے اپنی منزل کی طرف چلے۔ سردی اچھی خاصی تھی لیکن سفر مزیدار رہا۔ جب ہم اسٹیشن پر گاڑی سے اُترے تو ہمارے بہت سے رشتے دار ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔

اسٹیشن پر برسوں کے بچھڑے ماں بیٹی اور بھائی بہنوں کے ملاپ کا منظر بڑا ہی دلگداز تھا۔ ماضی کی وہ یاد ایک بار پھر میرے ذہن میں تازہ ہو گئی جب نانا میاں کے انتقال کے کئی سال بعد خالہ امی، خالو ابا اور نانا جان کے ساتھ کراچی آئی تھیں اور نانی اماں، امی جان، خالہ جان اور ماموں میاں سے لپٹ کر اس طرح بلک بلک کر روئی تھیں کہ گھر کی فضا بہت دیر تک سوگوار سی رہی تھی۔ میں گو اس وقت بہت چھوٹا تھا لیکن اس وقت گھر کے ہر فرد کی جو کیفیت تھی اس کا احساس آج تک میرے شعور میں موجود تھا۔ نجانے بچھڑے ہوئے عزیزوں کا یہ جذباتی ملاپ کب تک جاری رہتا کہ خالو ابّا نے موقع اور ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے قلیوں کو سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔ اسٹیشن سے باہر آئے تو کئی سائیکل رکشہ اور تانگے ہمارے منتظر تھے۔ خالو ابا نے شاید پہلے ہی سے ان رکشوں اور تانگوں کو ہمارے لئے روک لیا تھا۔ گھر کے پرانے ملازم جمّن میاں کی نگرانی میں خواتین تانگوں پر سوار ہوئیں۔ سامان بھی انہیں کے ساتھ رکھا گیا جب کہ ہم لوگ سائیکل رکشاؤں پر بیٹھے۔ دسمبر کی وہ شام بہت زیادہ سرد تھی جب دور دیس سے آیا ہوا یہ قافلہ اپنے میزبانوں کے ہمراہ اسٹیشن سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر واقع "ریاض منزل" کی جانب روانہ ہوا۔

میں جس سائیکل رکشہ پر سوار تھا اس کی سیٹ اتنی مختصر تھی کہ میرے اور خورشید بھائی کے درمیان بیٹھا عاصم سینڈوچ ہو رہا تھا حالانکہ خورشید بھائی اس کی خاطر سیٹ کی کگر پر ٹکے ہوئے تھے۔ کھلی رکشہ میں

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے رگوں میں خون منجمد کئے دے رہے تھے۔ "ہمارے یہاں تو اتنی سردی نہیں ہوتی۔" میں نے خورشید بھائی سے کہا۔ "ہاں سمندر کے کنارے زیادہ سردی نہیں ہوتی یہ دو آبے کا میدانی علاقہ ہے یہاں دسمبر جنوری میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ ابھی تو بارش نہیں ہوئی، بارش ہوگئی تو سردی اور بڑھ جائے گی۔" انہوں نے جواب دیا۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ رکشہ کی رفتار بہت کم ہوگئی ہے۔ میں نے ڈرائیور پر نظر ڈالی ایک ادھیڑ عمر کا انسان جس کے جسم پر معمولی کپڑے تھے رکشہ کو مسلسل آگے بڑھائے رکھنے کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کئے ہوئے تھا۔

اس کی سانس بُری طرح پھول رہی تھی۔ غالباً رکشہ اس وقت کسی چڑھائی پر سے گذر رہا تھا۔ آخر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ رکشہ سے اتر کر اسے ہاتھوں سے آگے بڑھانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر خورشید بھائی رکشہ سے اتر آئے میں نے اور عاصم نے بھی ان کی تقلید کی۔ خورشید بھائی نے بوڑھے

رکشہ ڈرائیور کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "باباتم چڑھائی طے کرلو پھر بیٹھ لیں گے" اس نے ممنون نظروں سے ہمیں دیکھااور کچھ کہے بغیر رکشہ آگے دھکیلنے لگا۔ چڑھائی ختم ہوئی تو ہم ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح سمٹ کر رکشہ پر بیٹھے۔ میں بیٹھنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن خورشید بھائی کے خیال سے کچھ نہ کہہ سکا پھر بھی میں نے ان سے پوچھ لیا، "آپ کے یہاں سائیکل رکشاؤں پر پابندی نہیں؟" بولے، "میاں یہ ہندوستان ہے یہاں لاکھوں لوگوں خاص طور پر غریب مسلمانوں کے روزگار کا ذریعہ یہی سائیکل رکشائیں ہی ہیں اگر ان پر پابندی لگ جائے تو اتنے بہت سارے لوگ اور ان کے اہل خاندان فاقہ کشی کا شکار ہو جائیں گے۔" عاصم بولا "خورشید بھائی! ہمارے یہاں تو آٹو رکشائیں چلتی ہیں یہاں کیوں نہیں چلتیں؟" خورشید بھائی بولے۔ "آٹو رکشائیں اور ٹمپو یہاں بھی ہیں مگر بڑے شہروں میں اور بہت کم تعداد میں۔ بمبئی، دہلی اور کلکتہ جیسے شہروں میں بھی زیادہ تر یہی سائیکل رکشائیں ہی چلتی ہیں۔" "لیکن بھائی آپ یہ تو دیکھئے کہ اس سواری کو چلانا اور اس پر بیٹھنا کس قدر اذیت ناک ہے، آخر آپ لوگ انسانیت کی تذلیل کس طرح گوارہ کرلیتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ خورشید بھائی میری اس بات کا کوئی جواب دیتے بوڑھا رکشہ والا جو ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ہنسا اور بولا "بیٹا! تم لوگ شاید پاکستان سے آرہے ہو سنتے ہیں کہ وہاں کے لوگ بہت سکھی ہیں ان کے پاس روزی، روٹی کمانے کے بڑے سادھن (ذرائع) ہیں لیکن بیٹا ہم لوگوں کو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے یہی رکشہ ہی سب سے سستا سادھن (ذریعہ) ہے۔" عاصم بولا، "باباتم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے تم سے تو رکشہ چلایا ہی نہیں جارہا۔" بولا، "ٹھیک کہتے ہو بیٹا اب ان بوڑھی ہڈیوں میں دم نہیں رہا لیکن کروں کیا اگر رکشہ چلانا بند کروں تو آٹھ جانوں کا پیٹ کیسے بھرے گا۔" خورشید بھائی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے، "یہ کریم بابا ہیں بڑے دکھی ہیں ان کا نوجوان بیٹا گذشتہ فسادات میں شدید زخمی ہو گیا تھا ڈاکٹروں کو اس کی جان بچانے کے لئے ایک پیر کاٹنا پڑا ہے۔ پہلے ایک درزی کی دکان پر کام کرتا تھا اچھے پیسے کما لیتا تھا لیکن معذور ہونے کے بعد اب ایک بیڑی کے کارخانہ میں ۵ روپے روز کی مزدوری کرتا ہے۔ گھر میں آٹھ افراد ہیں خود دار اتنے ہیں کہ کسی سے کوئی مدد لینا گوارہ نہیں کرتے ایسی مہنگائی میں گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے مجبوراً اب انہیں خود رکشہ چلانی پڑ رہی ہے۔" میں نے متاثر ہو کر کہا "کیا انہیں کوئی دوسرا کام نہیں مل سکتا۔" کریم بابا بولا "یہاں پڑھے لکھے مسلمان جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں ہم جیسے اَن پڑھ اور بوڑھوں کو کوئی اور کام کہاں ملے گا؟" رکشہ "ریاض منزل" کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔ خورشید بھائی اتر کر رکشے اور تانگے والوں کو کرایہ دینے لگے۔ تمام لوگ ریاض منزل کی ڈیوڑھی پار کر کے اندر جاچکے تھے البتہ جمن بابا گھر کی ملازمہ اور ایک لڑکے کے ہاتھ سامان اندر بھجوانے میں مصروف تھے میں سمجھ رہا تھا کہ گھر کا اندر کا ماحول ابھی

خاصا جذباتی ہو گا اس لئے میں وہیں کریم بابا کے پاس ہی کھڑا رہ گیا جو رکشہ کا سہارا لئے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں میں صاف دیکھ رہا تھا کہ جھریاں پڑی ان کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ہمارا ملک کم سے کم اس لعنت سے پاک ہے۔ وہاں روزی کمانے کے لئے لوگوں کو اس قدر ذلّت برداشت نہیں کرنی پڑتی کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کا بوجھ گھسیٹنے پر مجبور ہوں۔ میرے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا لیکن یہ ہندوستان تھا جہاں نہ جانے اور کتنے تجربات ہمارے منتظر تھے۔ خورشید بھائی کی آواز پر میں چونک پڑا وہ ڈیوڑھی پر کھڑے مجھے اندر آنے کے لئے کہہ رہے تھے کریم بابا نہ جانے کب اپنا رکشہ لے کر جا چکے تھے۔

خورشید بھائی کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ سبھی لوگ اس بات پر خوش تھے کہ اس تقریب نے مدتوں کے بچھڑے ہوؤں کو یکجا کر دیا۔ میرے لئے ہندوستان جا کر کسی شادی میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا۔ شادی کی رسمیں اور طور طریقے تو تقریباً یکساں ہی نظر آئے۔ البتہ جس بات کو میں نے شدت سے محسوس کیا وہ یہ کہ وہاں کی شادیوں میں سادگی اور کفایت شعاری کو بہت زیادہ دخل ہے۔ ہمارے یہاں کی طرح غیر ضروری شاہ خرچی اور ظاہری شان و شکوہ کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اظہار گرمجوشی میں کسی قسم کی بناوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو ایک روز ندیم بھائی ہمیں اپنے ایک ہندو دوست ہری چند جین کے یہاں لے گئے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو جین اور اس کے چند دوسرے ساتھی پاکستانی اسٹیج شو ڈرامہ "بکرا قسطوں پر" کی ویڈیو فلم دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہندوستان میں پاکستانی اسٹیج ڈراموں کی اس قدر مقبولیت پر تعجب ہوا۔ ڈرامہ اپنے اختتام پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ختم ہو گیا۔ جین ہم سب کو اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے ہمارا تعارف کراتے ہوئے بولا "سجنو (صاحبو) آپ لوگوں کو ہمارا دیس کیسا لگا"؟

"غریبی کچھ زیادہ ہی ہے۔" میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی عاصم بولا پڑا۔ جین اور اس کے ساتھی پہلے تو اس بے ساختگی پر عاصم کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ آخر جین سنبھلا اور بولا۔ "کیوں کیا آپ کے یہاں لوگ غریب نہیں ہیں؟"

عاصم بولا، "ہیں تو مگر اتنے نہیں کہ کڑاکے کی سردی میں کھلے آسمان تلے ٹھٹھر کر مر جائیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" جین نے حیرت سے پوچھا۔

عاصم سے پہلے ندیم بھائی بول پڑے عاصم تم شاید اخبارات میں شائع ہونے والی اس خبر کے حوالے سے کہہ رہے ہو جو چند روز قبل گنگا کے کنارے دو بھکشوؤں (فقیروں) کے شدید سردی میں اکڑ کر مر جانے

سے متعلق تھی اور جس پر ہم سب نے گہرے دکھ اور صدمے کا اظہار کیا تھا۔"

"جی ہاں آپ کا خیال درست ہے۔" عاصم نے جواب دیا۔

جین نے جوابی حملہ کیا "دوستو مانا کہ ہم غریب ہیں مگر ہم اپنی غریبی پر پردہ ڈالنے کے لئے کم از کم دوسروں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔"

عاصم بھلا کب دبنے والا تھا، بولا "ہمارا مذہب دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے کی ہدایت کرتا ہے اور دنیا کے تمام اسلامی ممالک اس پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے آڑے وقت پر کام آتے ہیں۔ ہمارا ملک اگر دوسرے برادر اسلامی ملکوں سے کوئی مدد لیتا بھی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ آخر بھائی ہی دوسرے بھائی کام آتا ہے، غیر نہیں۔"

جین کے ایک دوست نے اس پر ایک اور چوٹ کی، "مگر میرے بھائی اسلامی ممالک اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے اس بھرپور تعاون کے باوجود آپ کا ملک ہمارے دیش کی طرح خود کفیل نہیں، آپ کو اس قدر سہولتوں اور آسائشوں کے باوجود ہر چیز باہر سے ہی منگوا کر اپنا قیمتی زر مبادلہ ضائع کرنا پڑتا ہے۔"

مجھ سے نہ رہا گیا۔ کہنا ہی پڑا "میرے دوست آپ یہ بات اس لئے کہہ رہے ہیں کہ آپ کو تقسیم کے وقت سب کچھ پکا پکایا مل گیا۔ جبکہ ہمارے حصہ میں اول تو کچھ آیا نہیں اور جو آیا بھی وہ بھی آپ کے نیتاؤں (لیڈروں) کی بدعہدی کی بھینٹ چڑھ گیا، ہمیں تو تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ سنوارنا پڑا ہے اور اس کے لئے آج تک ہم قربانی دے رہے ہیں کہ کسی طرح ہمارا پیارا وطن سلامت رہے اور اسے استحکام نصیب ہو لیکن ہمارے دشمن کسی طرح چین نہیں لینے دے رہے۔"

بات چیت جس رخ پر چل نکلی تھی ندیم بھائی کو اس کا فوراً احساس ہوا انہوں نے فوراً مداخلت کی بولے، "بھئی آپ لوگوں نے یہ کیا بحث چھیڑ دی۔ غربت تو پوری تیسری دنیا کا مسئلہ ہے۔ کہیں کم ہے کہیں زیادہ ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ملک اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔" مجھے بھی اپنی جذباتیت پر کچھ غصہ آیا۔ ماحول کا تناؤ کم کرنے کے لئے میں بولا۔ "بھئی جین یہاں آکر ایک بات سے ہم ضرور پریشان ہیں اور وہ یہ کہ آپ کے اخبارات و رسائل و جرائد ہم نہیں پڑھ پاتے جبکہ آپ کی بولی ہماری سمجھ میں اچھی طرح آجاتی ہے۔ ہم اس پر بھی حیران ہیں کہ آپ کی بولی اور ہماری اپنی زبان اردو میں کچھ ایسا زیادہ فرق بھی محسوس نہیں ہوتا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" جین بولا "بولنے میں اردو اور ہندی ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں البتہ رسم الخط دونوں کا جدا ہے۔"

"مگر جین صاحب اردو تو اسی ملک میں پیدا ہوئی پلی بڑھی پھر آپ لوگوں نے اسے اپنے سے اتنا دور

کیوں کر دیا؟"

جین نے ہنستے ہوئے بڑی معنی خیز بات کہی۔ "اس طرح جس طرح قریب رہتے ہوئے آپ نے ہمیں اپنے سے دور کر دیا۔"

"دور ہم نے تو نہیں کیا، آپ کے بزرگوں نے ہی کچھ اس طرح کے حالات پیدا کر دیئے کہ ہمارے بزرگوں کو اپنے لئے ایک الگ خطہ زمین حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اسی دوران جین کا ملازم ہاتھ میں ایک وڈیو کیسٹ لئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس نے جین سے کہا "بیٹا! کشور کمار یہ وڈیو کیسٹ دے گیا ہے اور کہہ گیا ہے کہ آج شام تک آپ اسے دیکھ لیں رات کو یہ کسی اور کو دینا ہے اور ہاں وہ پہلا کیسٹ بھی مانگ رہا تھا۔" جین نے اس سے وڈیو کیسٹ لیتے ہوئے کہا، "رات میں ہم دونوں کیسٹ اسے واپس کر دیں گے۔" جین کے ایک ساتھی نے اس سے پوچھا "یہ کون سا کیسٹ ہے؟" جین نے کیسٹ کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ارے بھائی یہ تو وہی کیسٹ ہے جس کے لئے ہم کئی دن سے اس سے تقاضا کر رہے تھے۔" "اچھا یہ پاکستانی ٹی وی ڈرامہ سیریل 'وارث' ہے۔ ساتھی نے خوش ہو کر کہا۔ "عاصم پھر بول پڑا" آپ لوگوں کو پاکستانی اسٹیج اور ٹی وی ڈراموں سے بہت زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے؟"

جین نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا، "اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے اسٹیج اور ٹی وی ڈرامے ہمیں بہت زیادہ پسند ہیں۔ خاص طور پر آپ کے ٹی وی ڈراموں کا تو جواب نہیں۔"

"مگر آپ کے یہاں بھی تو ٹی وی ایسے بہت سے دلچسپ پروگرام پیش کرتا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں ہمارا دور درشن بھی اب اس قسم کے پروگرام تیار کرنے پر توجہ دے رہا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں کا ٹی وی ہمارے دور درشن سے بہت آگے ہے۔ جس طرح پاکستان میں بھارتی فلموں کے لئے بہت زیادہ "کریز" ہے اسی طرح ہمارے یہاں آپ کے ٹی وی اور اسٹیج ڈراموں کی بہت قدر و منزلت ہے۔" جین کے اس اعتراف سے میرا دل فخر اور مسرت کے احساس سے جھوم اٹھا۔

نوکر ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوا اس بار اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے، گرم گرم سموسوں اور گاجر کے حلوے کی پلیٹیں تھیں اور ظاہر ہے کہ سخت سردی میں کیتلی سے اٹھنے والی دارجلنگ ٹی کی بھاپ اور حلوے کی اشتہا انگیز خوشبو ہماری گفتگو پر کیونکر غالب نہ آجاتی۔

نانی اماں کئی روز سے خالو ابا اور خالہ امی سے گاؤں چل کر چند روز پرانی حویلی میں قیام کرنے پر زور دے رہی تھیں۔ ان کے شدید اصرار پر ایک اتوار ہم سب گاؤں کے لئے روانہ ہوئے۔ شہر سے

تقریباً ۲۰ کلومیٹر دور ہمارا یہ گاؤں چند مسلمان گھرانوں کے سوا زیادہ تر ہندو آبادی پر مشتمل ہے۔ گاؤں کے اطراف کئی پہروے بھی آباد ہیں جن میں شودروں مثلاً چمار، پاسی اور اہیروں کی اکثریت ہے۔ ہمارے تانگے جب گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو تقریباً شام ہوچکی تھی۔ ملگجے اندھیرے میں گاؤں کے کچے پکے مکانوں سے دھواں اٹھتا نظر آرہا تھا اور کسان کندھوں پر ہرے چارے کے بوجھ اٹھائے ڈھورڈنگروں کو گھروں کی طرف لے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچے پکے راستوں سے گذرتے ہوئے جب ہمارے تانگے آبائی گھر پرانی حویلی کے سامنے رکے تو شام خاصی گہری ہوچکی تھی۔ ہمارے آنے کی اطلاع حویلی والوں کو شاید مل گئی تھی اسی لئے جیسے ہی تانگے رکے حویلی کے مکینوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہاتھ منہ دھلانے اور تازہ دم کرنے کے بعد جب حویلی کے صحن میں لالٹینوں اور لیمپ کی روشنی میں ہمیں تلے ہوئے سبز مٹر، گرم گرم پکوڑے اور چائے پیش کی تو یقین کیجئے بہت ہی مزا آیا۔ گاؤں میں ہمارا قیام تین چار روز رہا۔ ہم ہر صبح ناشتہ کے بعد کھیتوں اور باغوں کی طرف نکل جاتے اور خوب گھومتے۔ سبز مٹر کی پھلیاں اور چنے کا ساگ، ہری مرچ، لہسن اور نمک ملی چٹنی کے ساتھ بڑا مزا دیتے

............اور پھر یہ اس رات کا ذکر ہے جس کی صبح ہمیں واپس شہر جانا تھا، کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ حویلی کے بڑے ہال میں انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے آگ سے ہاتھ تاپ رہے تھے۔ نانی اماں تینوں بیٹوں کو قریب بٹھائے نہ جانے کن سرگوشیوں میں مصروف تھیں خالو ابا اور ماموں میاں آمنے سامنے آرام کرسیوں پر نیم دراز سیاست کے بخئے ادھیڑ رہے تھے اور ہم سب بھائی بہن سامنے پڑی تلی ہوئی میٹھی مونگ پھلی کی پلیٹوں پر ہاتھ صاف کئے جارہے تھے۔ باہر سخت سردی تھی تیز ہواؤں کا شور ہال کے اندر صاف محسوس ہورہا تھا۔ ابھی صرف دس ہی بجے تھے لیکن یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کافی رات بیت چکی ہے۔ دفعتاً ڈیوڑھی پر کچھ شور سنائی دیا اور یوں لگا جیسے کوئی عورت اور بچے چیخ چیخ کر رورہے ہیں ابھی سب لوگ اس صورتحال کو سمجھنے کی کوشش ہی کررہے تھے کہ ہال کا بڑا دروازہ کھول کر امامن بُوا بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئیں اور خالہ امی سے مخاطب ہو کر بولیں "بی بی بڑا غضب ہوگیا میرو قصائی کو ٹھاکروں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے اس کے بیوی بچوں کو گھر سے نکال کر سارا سامان توڑ پھوڑ دیا ہے۔" "مگر کیوں؟" خالو ابا نے آرام کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "معلوم نہیں آپ خود چل کر ان غریبوں سے معلوم کرلیں۔" خالو ابا کو ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے دیکھ کر ہم لوگ بھی ان کے پیچھے لپکے۔

میرو قصائی کی بیوی نے رو رو کر جو بپتا سنائی اس کے مطابق اس کے بڑے بیٹے نے بھولے سے اس کنویں میں اپنا ڈول ڈال دیا تھا جو ٹھاکروں اور ہندوؤں کے لئے مخصوص تھا۔ اس کی اطلاع جب ٹھاکروں کو ملی تو وہ اس کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ لڑکا تو ان کے ہاتھ پڑا نہیں اس گستاخی کی سزا انہوں نے بوڑھے باپ کو

دی۔ اسے مارا پیٹا اور سب کو گھر سے نکال کر سارا سامان الٹ پلٹ دیا۔ میرو قصائی کی بیوی خالو ابا سے اس ظلم و زیادتی پر ان کی مدد کی خواہاں تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کنویں سے پانی بھرنا اتنا سنگین جرم کیسے بن گیا؟ بعد میں خالو ابا اور ندیم بھائی کی گفتگو سے یہ عقدہ کھلا کہ ہندوستان میں آج بھی برہمنوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں میں چھوت کا مرض پوری طرح موجود ہے اور وہ ہریجنوں اور مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان کے مذہبی اور رفاہ عام کے اداروں کو ہاتھ لگائیں یا ان کے قریب سے گذریں اور اگر کبھی کسی سے اس قسم کی کوئی حرکت ہوجاتی ہے تو اسے گستاخی کا مزا چکھانے کے لئے اونچی ذات کے ہندوؤں کی پوری برادری اپنے پورے غیض و غضب کے ساتھ حرکت میں آجاتی ہے۔ اور خون خرابہ کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔

گاؤں سے شہر واپس آتے ہوئے میں دل ہی دل میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے ہمیں پاکستان جیسا انمول تحفہ اور انعام عطا کیا کہ جہاں کوئی رکشہ کھینچنے والا بوڑھا روٹی روزی کمانے کے لئے اپنی بوڑھی ہڈیوں کا آخری زور لگانے پر مجبور نہیں نہ ایسے فقیر اور محتاج ہیں جو سخت سردی میں ٹھٹھر کر جان دے رہے ہوں اور نہ میرو قصائی جیسے غریب اور نادار لوگ ہیں جن کو اونچی ذات کے لوگ محض کنویں سے پانی بھرنے کی جسارت پر مار مار کر ادھ موا کر دیں اور انہیں گھر سے بے گھر کر دیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کی ہمیں دل سے قدر کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ کے اس انعام کو کلیجہ سے لگا کر رکھنا چاہئے اسی میں ہماری بھلائی ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص بس میں سفر کر رہا تھا۔ وہ شخص بس میں اپنی سیٹ پر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے کہا۔ خواتین و حضرات کیا آپ میں سے کسی کا سو سو کے نوٹوں کا ایک بنڈل جس کے گرد ربڑ کا حلقہ بندھا ہوا تھا۔ گم ہوا ہے۔

یہ سنتے ہی چالیس مرد اور عورتیں یک زبان ہو کر بولے "ہاں"۔

اس پر آدمی نے لاپروائی سے کہا "میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ ربڑ کا حلقہ مجھے ملا ہے۔"

معراج الدین معین الدین کراچی

بیوی عورت نے اپنے شادی شدہ بیٹے سے کہا "بیٹے تم اپنے سسرال پہلی مرتبہ جارہے ہو اسلئے ہر بات بڑھا چڑھا کر بولنا"

وہ آدمی سسرال پہنچا تو اسکی ساس نے پوچھا "بیٹے تم بس سے آئے ہو؟"

"نہیں میں جہاز میں آیا ہوں۔ پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر یہاں پہنچا ہوں" دوبارہ پوچھا "چائے پیوگے؟" "نہیں میں بوتل پیتا ہوں۔" پھر اسکو چھینک آئی تو ساس بولی "ارے تمہیں تو نزلہ اور کھانسی ہے" وہ بولا جی نہیں مجھے نمونیا ہے اور ٹی بی ہونے والی ہے۔"

محمد مصباح الدین۔ کراچی

دلدل

قسط نمبر ۷

حمید کاشمیری

راشد کا باپ رمضان ڈرائیور بیرون پینے کا عادی تھا۔ راشد کو بھی ویڈیو گیم کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ گھنٹوں گھر سے غائب رہتا۔ اس کی ماں ان دونوں باپ بیٹوں کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان رہتی۔ ایک روز جب راشد حسب معمول جب ویڈیو گیم کھیلنے میں مشغول تھا، اس کی ماں روتی پیٹتی وہاں آئی اور یہ روح فرسا خبر سنائی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ باپ کے مرنے کے بعد راشد کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اُس نے بُری عادتوں سے

توبہ کرلی. تعلیم حاصل کرنا تو اُس کے لئے ممکن نہ تھا. البتہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اُس نے اپنے والد کے دوست رحمت مستری کی ورکشاپ پر کام کرنا شروع کردیا. ان دنوں شہر کے حالات کچھ ٹھیک نہیں تھے. آئے دن کے ہنگاموں اور کرفیو کی وجہ سے زندگی اجیرن ہوگئی تھی. راشد کا گھر تو بفرزون کے علاقے میں تھا اور ورکشاپ میوہ شاہ قبرستان کے قریب ہر روز آنا جانا خطرے سے خالی نہ تھا. کسی ممکنہ بُری خبر سے بچنے کے لئے رحمت مستری نے راشد کی والدہ سے بات کرکے راشد کو رات دن مستقل اپنے ورکشاپ پر رکھنے کا فیصلہ کرلیا. وہ دن بھر تو خوشی خوشی کام کرلیا کرتا تھا لیکن یہ پہلی رات کاٹنا اُس کے لئے مشکل ہوگیا. وہ اس آسیب زدہ ماحول میں ڈر رہا تھا. وہ بستر پر لیٹا تھا لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی. خوف کی ایک لہر بار بار اُس کے بدن میں بار بار جھُرجھری پیدا کردیتی آخرکار وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا.

اُس کے اُٹھ بیٹھنے سے اس کے ساتھی بھی اُٹھ بیٹھے اور یوں خوفزدہ ہونے پر اس کا مذاق اُڑایا. لیکن راشد سچ مچ ڈر رہا تھا. اس پر ان لوگوں کی تلقین کا کچھ اثر نہ ہوا اور جب وہ منہ لپیٹ کر سوگئے تو راشد تکیہ اور چادر بغل میں دبا کر ورکشاپ کی چھت پر چڑھ گیا... کافی دیر اِدھر اُدھر کے خیالات اُسے ستاتے رہے. پھر وہ نیند کی وادیوں میں گم ہوگیا. نجانے رات کا کون سا پہر تھا. جب وہ ہڑبڑا کر اُٹھا... اُس نے دیکھا کہ چند لوگ میّت گاڑی میں سے اُترے اور ایک میّت کو اُٹھا کر قبرستان کے اندر لے گئے جہاں انہوں نے اس کفن پوش کو ایک تازہ کھُدی ہوئی قبر میں اُتار دیا... لیکن راشد نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ قبر میں اُتاری جانے والی چیز لاش نہیں بلکہ لکڑی کی دو پیٹیاں تھیں.

صبح سویرے سب سے پہلے اکو کی آنکھ کھُلی. اُس نے دیکھا تو راشد کو نہ پاکر پریشان ہوگیا. اسلم اور گولا بھی جاگ گئے اور انہوں نے راشد کو چھت پر سوتا ہوا دیکھ لیا. ان کے جگانے پر راشد نیچے اُترا اور رات کا سارا واقعہ اُنہیں سُنایا، مگر کوئی بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہ تھا. تینوں نے اس کا خوب مذاق اُڑایا. تھوڑی دیر بعد اُستاد بھی ورکشاپ پر آگئے. ان کے ساتھ ایک صاحب تھے. شاہ جی. یہ چاروں شاہ جی ہی کی کار کو ٹھیک کررہے تھے. گولے نے استاد کو بھی راشد کے بارے میں بتایا اور استاد کے پوچھنے پر راشد نے ایک بار پھر رات والا واقعہ دہرایا. اسے سُن کر اُستاد سے زیادہ شاہ جی چونکے لیکن بات ٹال گئے. گاڑی کی ٹرائی لینے کے لئے شاہ جی اپنے ساتھ راشد کو لے گئے. اور راستے میں تمام حالات معلوم کئے. راشد نے اُنہیں سب کچھ تفصیل سے بتادیا. شاہ جی نے اُسے اپنا بنگلہ دکھایا اور کسی بھی ضرورت کے وقت اپنی مدد کا یقین دلایا. راشد واپس آکر اپنے کام میں مگن ہوگیا. رات کے وقت اُسے کسی ضرورت سے قبرستان جانا پڑا تو واپسی میں عیسٰی گورکن سے ملاقات ہوگئی. عیسٰی گولے کا باپ تھا. اور اُسے بھی راشد کی زبانی رات والے قصّے کا علم ہوچکا تھا. وہ اُسے ایک تازہ کھُدی ہوئی قبر کے پاس لے گیا اور اُسے زبردستی قبر میں گرا کر اُس پر مٹّی ڈالنے لگا. باوجود کوشش کے خوف کی وجہ سے راشد کی آواز نہ نکل سکی.

راشد قبر میں پڑا تھا. عیسٰی گورکن اُسے دھمکیاں دینے کے علاوہ دھیرے دھیرے مٹی اُس کے اُوپر ڈال رہا تھا. اُس نے کئی بار کوشش کی کہ چیخے یا زور لگا کر مٹی کے اس ڈھیر سے باہر نکل جائے مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے. وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوا. اسے اپنی موت کا یقین ہوچلا تھا. لیکن پھر قدرت کو اُس پر رحم آگیا. عیسٰی گورکن کی ننھی بچی نوشی کہیں سے اُسے ڈھونڈتی ہوئی اُدھر آنکلی. وہ راشد کو زندہ دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر حیران اور خوفزدہ ہوئی مگر عیسٰی نے بات بنائی کہ وہ تو قبر کا ناپ لے رہا تھا. نوشی کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی. عیسٰی نے اُسے قبر سے نکالا اور دھمکیاں دے کر بھگا دیا. راشد کی کیفیت بڑی عجیب ہوگئی تھی. وہ تاریک سڑک پر چلا جارہا تھا. اب اُسے کسی چیز کا خوف نہیں رہا تھا. وہ ایک چائے خانے پر پہنچا. اُس نے چائے پینے کے دوران نشہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک بوڑھے ہیروئنچی کو تڑپتے ہوئے دیکھا. وہ دس روپے مانگ رہا تھا. راشد نے اُسے دس روپے دیئے تو وہ فوراً نشے کے حصول کے لئے وہاں سے بھاگ گیا. اس نشے کے عادی شخص کا ایک معصوم بچہ جو اُسے گھر لے جانے کے لئے آیا تھا رونے لگا. امجد سے گفتگو کے دوران راشد کو پتا چلا کہ امجد کی کہانی بھی بالکل راشد جیسی ہے. راشد افسردہ ہوا. اور وہاں سے واپس آگیا. راستے میں اُسے ایک کار والے نے روکا اور کار میں بٹھا لیا. یہ شاہ جی تھے. راشد نے شاہ جی کو بھی تمام واقعات سُنائے. شاہ جی فوراً عیسٰی گورکن کے گھر پہنچے اور اُسے دھمکی دی کہ اگر آئندہ اُس نے راشد کو تنگ کیا یا اُس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اُس کی خیر نہیں ہوگی. ابھی یہ لوگ عیسٰی کے گھر سے چند قدم دُور ہی گئے تھے کہ کسی جانب سے دو فائر ہوئے اور عیسٰی خون میں لت پت زمین پر گر پڑا.

راشد کے اغوا سے قبرستان کی ساری بستی میں خوف اور دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ شاہ جی اور رحمت مستری الگ سے پریشان تھے۔ رحمت مستری راشد کی تلاش کے سلسلے میں اُس کے گھر بھی گیا لیکن اُس کی ہمت نہ پڑی کہ راشد کی ماں کو راشد کے اغوا کے بارے میں بتا سکتا۔

علاقے کا بڑا آدمی سردار آسمانی بھی شام کو وہاں آیا اور لوگوں کے ایک ہجوم کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اُس نے پولیس کی نااہلی پر تنقید کرتے ہوئے عوام کی جان و مال کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔

راشد کو اغوا کر کے جس جگہ لے جایا گیا وہ ایک گودام تھا جہاں مختلف قسم کی چیزیں ذخیرہ کی گئی تھیں، اُن اشیا کا معائنہ کرتے ہوئے راشد کو ہیروئین کے بھی بہت سے تھیلے نظر آئے۔ اُس نے تھوڑی سی ہیروئن اپنے لباس میں چھپالی۔ اس کے علاوہ اُس نے کافی مقدار میں پسی ہوئی مرچوں کی ایک بڑیا بنا کر اپنے نیفے میں اُڑس لی۔

اگلی صبح اُس گودام میں راشد نے سردار آسمانی کو دیکھا جو اپنے ماتحتوں سے "مال" کے لانے لے جانے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اُس نے راشد کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے حرکاروں کے حوالے کر دیا جو اُسے ایک ٹرک میں ڈال کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

راشد کے حساب سے ٹرک تقریباً چار گھنٹے چلا ہو گا۔ جب وہ اچانک ایک جگہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس وقت راشد نے آس پاس کہیں کسی چیل کی آواز سنی۔ اور کہیں کوا بھی ہلکی آواز میں کائیں کائیں کر رہا تھا۔ جس سے راشد نے محسوس کیا کہ صبح یا تو نمودار ہو گئی ہے یا صبح کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ دیر رکنے کے بعد ٹرک نے سمت متقرر کی اور بائیں جانب کو مڑا، لیکن بہت سست رفتار سے اور اونٹ کی طرح اونچا نیچا ہو کے چلنے لگا۔ جس سے راشد نے اندازہ لگایا کہ بہت ہی خستہ اور کچا راستہ ہے یا جیسے پیدل چلنے کی پگڈنڈی ہو۔ کوئی پانچ منٹ اس غیر ہموار راستے پر چلنے کے بعد ٹرک اچانک رک گیا۔ انجن بند ہوا۔ اور راشد نے محسوس کیا کہ آگے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی نیچے اترے ہیں کیونکہ اس نے آگے کے دونوں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنیں۔ پھر دونوں گھوم کر پیچھے آئے اور باہر والے ایک نے اندر والے راشد کے محافظ کو آواز دے کر پوچھا۔

"ہاں بھئی کھوسے۔ سب ٹھیک ہے ناں"

"ٹھیک ہے استاد۔" کھوسے نے جواب دیا۔

"سو رہا ہے جاگ رہا ہے؟" باہر والے نے پوچھا۔

"پتہ نہیں....." یہ کہہ کر کھوسے نے ایک زور کی دھپ راشد کے کولہے پر لگائی۔ "اٹھ جا....." وہ ساتھ ہی پکارا۔

"راشد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے گہری نیند سے اٹھا ہو۔"

"پٹی کھول دو اس کی۔ ناشتہ کر لے" باہر سے آواز آئی اور اندر والے نے راشد کی آنکھوں

سے پٹی کھولی تو راشد جیسے دوسری دنیا میں آ گیا۔

صبح نور کا تڑکا تھا۔ ملگجی ہلکی پھیکی مدہم روشنی۔ چھوٹا تنگ سا ایک پاس تھا جس میں ٹرک کھڑا تھا دونوں جانب اوپر آسمان کی طرف اٹھے ہوئے سنگلاخ پہاڑ تھے جن کے اندر ٹرک گھرا ہوا تھا۔ راشد نے لمبی لمبی سانس لی اور آنکھوں کو کئی دفعہ کھولا بند کیا اور بغیر چھت کے ٹرک سے کھلے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

ایک نئی روشنی ایک نئی زندگی کا احساس اسے ہوا، لیکن وہ جانتا تھا یہ سب کچھ تھوڑی دیر کے لئے ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی ہوگی اور جب پٹی کھلے گی تو وہ خرکاروں کے پاس بیگار کیمپ میں ہوگا۔

"یہ لے چائے اور یہ ڈبل روٹی ہے۔ ایسی ڈبل روٹی ترے باپ نے بھی کبھی نہیں کھائی ہوگی۔"

کھوسے نے تھرموس سے چائے کا مگ بھرا اور ایک کڑک روٹی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیسے پکڑوں....." راشد نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس پر تینوں ڈاکو قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"ارے اس جناور کے ہاتھ تو کھول۔" پہلے آدمی نے کھوسا سے کہا۔

کھوسو نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی رسی کھولی اور چائے اور ڈبل روٹی راشد کو تھمادی۔ ہاتھ کھلنے پر راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ سو برس سے ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

"پاؤں نہیں کھولو گے....." راشد نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیوں ناشتہ پاؤں سے کرے گا ..... دوں گا ایک ہاتھ منہ پر۔" کھوسے نے تڑی دی۔ "جلدی سے فارغ ہو جا"۔

"آجا ہم بھی ناشتہ کر لیں۔" پہلے آدمی نے کھوسے سے کہا اور پھر تینوں ناشتہ کرنے کے لئے راشد کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ غالباً وہ ٹرک کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ گئے تھے اور ساتھ ساتھ آس پاس نگرانی بھی کر رہے تھے۔ چائے گرم تھی اور ڈبل روٹی واقع کڑک اور مزیدار۔ راشد نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ لہٰذا ڈبل روٹی اور چائے نے خوب مزہ دیا۔ اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ ہر چند کہ اس کے پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ لیکن ہاتھ چل رہے تھے اور ساتھ ساتھ دماغ بھی متحرک تھا اور کچھ نہ کچھ مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ کوئی ایسی ترکیب جو اسے ان لوگوں کے چنگل سے فرار ہونے میں مدد دے۔ ناشتہ سے فارغ ہونے تک روشنی ٹھیک ٹھاک نکل آئی تھی اور پہاڑ کی چوٹی پر سورج کی کرن بھی دکھائی

دینے لگی تھی۔

"کر لیا ناشتہ.....؟" کھوسے نے ٹرک کی عقبی سمت سے نمودار ہو کر پوچھا۔

"جی کر لیا....." اس نے آہستہ سے کہا۔

"لاؤ پھر تیرے ہاتھ باندھ دوں....." کھوسے نے رسی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان پہلے مجھے ایک ڈبہ دے دو۔" راشد نے درخواست کی۔

"ڈبہ....." کھوسے نے حیرت سے پوچھا "کیسا ڈبہ؟"

"کوئی ٹین۔ پلاسٹک کا ڈبہ مجھے پیشاب وغیرہ کرا دو۔" راشد نے مزید التجا کرتے ہوئے کہا۔

"دھت تیری کی....." کھوسے نے اسے ایک بڑی سی گالی دی۔ "میں تیرے باپ کا نوکر ہوں کہ تیری رفع حاجت کیلئے ڈبے رکھوں؟"

"تو پھر میں کیا کروں میرے پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور مجھے.....!" راشد نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ عذر بہت معقول تھا کھوسے نے نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں سے رائے لی۔

"دوسرے نے بھی اتفاق کیا تو کھوسو چھلانگ لگا کے ٹرک کے اندر چلا گیا۔ اور راشد کے پاؤں کی رسی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "ایک بات غور سے سن لے چھوکرے۔ پیشاب کیلئے تیرے پاؤں کھول رہا ہوں۔ لیکن تیرے پاس کھڑا رہوں گا میں۔"

"ٹھیک ہے صاحب..... مجھے کیا اعتراض آپ دور کھڑے رہیں یا پاس مجھے تو....."

"اور دوسری بات بھی سن لے۔" کھوسو راشد کی بات کاٹ کر بولا "اگر بھاگنے کی کوشش کی تو....."

"تو گولی مار دینا....." اب کے راشد نے اس کی بات کاٹی۔ "پستولیں بندوقیں آپ تینوں کے پاس ہیں پھر ان پہاڑوں کے اندر میں بھاگ کر جاؤں گا کہاں"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آجا نیچے۔ پر جلدی فارغ ہو جانا۔" کھوسو کا ہاتھ راشد کے پاؤں کی رسی کی طرف گیا جونہی اس نے رسی کھولی راشد نے بڑے نامعلوم طریقے سے کھجانے کے بہانے ہاتھ نیفے میں ڈالا اور پسی ہوئی مرچوں کا لفافہ جو اس نے گودام سے پار کیا تھا نیفے سے باہر نکالا اور مرچوں کی مٹھی بھر کے بڑی تیزی کے ساتھ کھوسو کی آنکھوں میں ڈال دی۔ مرچیں ٹھیک نشانے پر پڑیں اور کھوسو جیسے ایک لمحے میں اندھا ہو گیا۔ وہ درد سے تڑپا آنکھیں ملتے ہوئے چلایا۔ ایک زور دار چیخ ماری۔ اس کی چیخ سن کے دونوں باہر والے آدمی ٹرک کے اندر کی جانب لپکے لیکن ابھی وہ ٹرک میں جھانکے ہی تھے کہ راشد پہلے ہی سے بلے کی طرح جھپٹنے کیلئے تیار تھا۔ لفافہ اس کے ایک ہاتھ میں تھا اور مٹھی بھر مرچیں دوسرے ہاتھ

میں۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے ایک مٹھی ایک کی آنکھوں میں اور مرچوں کی دوسری مٹھی دوسرے کی آنکھوں میں جھونک دی۔ دونوں بے اختیار چیخے اور ان کی چیخ پہاڑوں کے بیچوں بیچ گنبد کی آواز کی طرح گونج گئی۔ دونوں جیسے اندھے ہو گئے۔ تیسرا پہلے ہی اندھا ہو چکا تھا۔ وہ تڑپ گئے اور صبح کی روشنی کے باوجود اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ تینوں کو آنکھیں ملتا چھوڑ کر راشد نے چیتے کی طرح جست لگائی اور یہ جا وہ جا، غائب ہو گیا۔ وہ اسی کچی اور پگ ڈنڈی نما سڑک سے دوڑتا ہوا پکے روڈ پر آگیا جہاں سے ٹرک اندر پگ ڈنڈی میں مڑا تھا۔ ویران سنسان سڑک بندہ نہ بندے کی ذات۔ نہ کوئی بستی، نہ کوئی گھر نہ دکان چاروں طرف پہاڑیاں ہی پہاڑیاں۔ وہ پلٹ پلٹ کے پیچھے پگ ڈنڈی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید اس کے تعاقب میں کوئی آرہا ہو۔ لیکن ابھی تک اسے تعاقب کرتا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ غالباً مرچیں بہت اصلی، اچھی اور تیز تھیں جو ابھی تک اپنا کام دکھا رہی تھیں۔ راشد سڑک کے کنارے کھڑا ہر لمحے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کیا کرے اور کس طرف بھاگے اسے یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سڑک کس طرف جا رہی ہے۔ پھر اچانک اس نے فائرنگ کی آواز سنی۔ یہ آواز اسی گھاٹی سے آرہی تھی جہاں ٹرک کھڑا تھا اور جہاں سے وہ فرار ہو کے آیا تھا۔

"شاید ان کی آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔" راشد نے سوچا "اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔" اس نے مزید سوچا اور پھر یہ سوچے بغیر کہ سڑک کس طرف جاتی ہے وہ سڑک سرپٹ دوڑ پڑا۔ اچانک اسے مخالف سمت سے ایک کار بہت تیزی کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ یہ کار اس کیلئے موت بھی تھی اور زندگی بھی۔ وہ مایوس بھی ہوا اور اسے امید بھی لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ بھی وہی لوگ ہوں لیکن اس نے پھر سوچا کہ ایسا نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس مزید سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ کار بالکل قریب آچکی تھی۔ وہ ایک دم کار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کار نے ایمرجنسی بریک لگائی۔ کار کی بریک کی آواز پہاڑیوں کے دامن میں گونج گئی۔

"مرنے کیلئے تمہیں کوئی اور جگہ نہیں ملی۔" کار کے ڈرائیور نے منہ باہر نکال کر اسے زوردار ڈانٹ پلائی۔ وہ دو آدمی تھے۔ کار ڈرائیور کے برابر میں جو آدمی بیٹھا تھا وہ خاصا ہٹا کٹا اور پراسرار لگ رہا تھا۔ "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو.....؟" اس نے پررعب لہجے میں پوچھا۔

"کیا میں بھاگ جاؤں....." راشد نے سوچا "لیکن بھاگ کر کہاں جاؤں گا۔ صرف ایک گولی اس کا خاتمہ کر دے گی۔" وہ مزید سوچنے لگا۔ "یہ کون لوگ ہیں۔ کیا یہ بھی ٹرک کے ساتھ ہی تھے۔ کیا انہیں لوگوں کے ساتھی ہیں یہ بھی"

"ہم نے پوچھا ہے کون ہو تم..... اور کہاں سے بھاگ کر آئے ہو" کار ڈرائیور کے ساتھی نے اس سے گرجدار آواز میں پھر پوچھا

"میں م م م میں..... "وہ ہڑبڑایا "جی مجھے بچالو" راشد کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان لوگوں سے ہی مدد مانگے۔ کیونکہ اب وہ گھر تو گیا تھا اور مرنا اس نے ہر صورت میں تھا ہی۔

○

اُس دن شاہ جی صبح صبح رحمت مستری کے گیرج پر آگئے۔ دونوں خاصے پریشان تھے، شاہ جی نے مستری رحمت کو مشورہ دیا کہ اب انہیں راشد کی ماں کو پوری صورتحال سے آگاہ کرنا چاہئے

"میں جانتا ہوں مستری یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔" شاہ جی نے کہا۔"لیکن اب ہم زیادہ دن تک یہ خبر اس کی ماں سے چھپا نہیں سکتے..... " آجاؤ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" شاہ جی نے مستری کو حوصلہ دیا اور دونوں راشد کی ماں کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جب دروازہ کھٹکھٹایا تو راشد کی ماں نے ہی دروازہ کھولا۔ اس کے چہرے پر بہت سنجیدگی اور کسی حد تک خوف وہراس بھی تھا۔ وہ چپ چاپ خاموش کھڑی دونوں کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کو راشد کی گمشدگی کی اطلاع مل چکی ہے۔ "بہن ہم اندر آسکتے ہیں..... " رحمت مستری نے بہت انکساری سے کہا۔ راشد کی ماں نے سر جھکا کے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ مستری رحمت اور شاہ جی دونوں اندر داخل ہوئے اور صحن ہی میں پڑی کرسی اور مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

"بیٹھو بہن تم بھی بیٹھو..... " مستری رحمت نے راشد کی ماں سے التجا کی، جواب تک خاموشی کی تصویر بنی چپ چاپ تھی۔ راشد کی ماں نیچے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ خوف اور اداسی اس کے چہرے پر ابھی تک چھائی ہوئی تھی۔ وہ سخت مضطرب اور پریشان تھی۔

"بہن یہ شاہ جی پولیس کے بڑے افسر ہیں۔ بڑے ہمدرد اور دوست ہیں ہمارے۔" اب کے شاہ جی بولے "لیکن آپ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاید راشد کے بارے میں آپ کو خبر مل چکی ہے"

"کیسی خبر..... " اب کے راشد کی ماں چونکی۔ اور شاہ جی بغیر کسی تمہید کے بولے۔

"بہن راشد اغوا ہو گیا ہے۔" شاہ جی نے بادل نخواستہ کہہ ہی دیا۔

"اغوا ہو گیا تھا۔ " اچانک اندر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور راشد نمودار ہو کر بولا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

تم..... شاہ جی چونکے

"راشد..... " رحمت مستری ہکا بکا رہ گیا۔ دونوں کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔

(باقی آئندہ)

شین فاروقی

سادہ پودے اور اسفنج

پودوں کی طرح تمام حیوانات بھی خلیوں سے بنے ہیں۔ اکثر حیوانات بہت سے خلیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان خلیوں میں کچھ دماغی خلیے ہیں، کچھ ہڈیوں کے خلیے اور کچھ خون کے خلیے وغیرہ وغیرہ۔ حیوان کے جسم کا ہر حصہ ایک خصوصی خلیہ سے بنا ہوتا ہے جو ایک خاص انداز میں عمل کرتا ہے۔ حیوان کے جسم کا ہر خلیہ اس حیوان کو زندہ اور صحت مند رکھنے کے سلسلہ میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

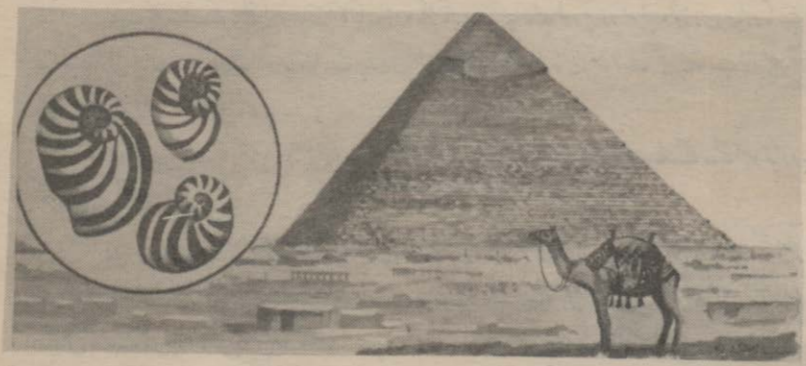

سمندر میں مخصوص اقسام کے گھونگے پائے جاتے ہیں۔ جب یہ گھونگے ہلاک ہوجاتے ہیں تو یہ سطح پر آجاتے ہیں۔ صدیاں گزرنے کے بعد یہ گھونگے پتھروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ خیال ہے کہ اہرام مصر میں استعمال ہونے والے پتھر اسی طریقے کے باعث وجود میں آئے تھے۔

پروٹوزونس۔ سادہ حیوانات یعنی simplestanimals صرف ایک خلیہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان حیوانات کو پروٹوزونس کہا جاتا ہے پروٹوزونس کا مطلب ہے "پہلے حیوانات" یعنی پروٹوزونس زمین پر پیدا ہونے والے سب سے پہلے حیوانات ہیں۔ اگرچہ پروٹوزونس ایک خلیہ پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ حرکت کر سکتے ہیں، اپنی غذا حاصل کر کے اسے کھا سکتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ یہ فضلہ پیدا کرتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور نئے پروٹوزونس پیدا کرتے ہیں۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کے مطابق تمام حیوانات عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم پروٹوزونس کو حیوانات ہی کہیں گے یہ اور بات کہ وہ حیوانات کی طرح نظر نہیں آتے۔

پروٹوزونس بہت چھوٹے سے ہوتے ہیں اتنے چھوٹے کہ ان میں سے اکثر کو صرف خوردبین کی مدد سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑا پروٹوزون ہمارے ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے برابر ہوتا ہے۔ چونکہ پروٹوزونس طویل عرصے تک پانی کے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے یہ عام طور پر سمندر، دریاؤں، جھیلوں اور نم زمین میں رہتے ہیں۔ یہ دوسرے جانوروں کے اندر بھی رہتے ہیں۔

اموبا نام کا پروٹوزون بہت سے پروٹوزونس کی طرح ہوتا ہے۔ یہ جیلی کے ایک قطرے کی طرح ہوتا ہے۔ جسامت کے اعتبار سے یہ پین کے نب کے سرے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک سیاہ دھبہ ہوتا ہے جو دراصل اس کا مرکزہ ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت اموبا کا دماغ ہوتا ہے۔ اموبا کے پاؤں نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ چلنے کے لئے اپنی ہیئت کو تبدیل کرتا ہے۔

پیٹ بھرنے کے لئے اموبا غذا کا ایک ذرہ پکڑتا ہے۔ یہ عام طور پر دوسرا پروٹوزون سا ہوتا ہے اپنی غذا کو حاصل کرنے کے لئے اموبا غذا کے چاروں طرف اپنے جسم کو پھیلا کر اسے گھیر لیتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اپنی غذا کو ہضم کر جاتا ہے۔

اموبا پانی سے آکسیجن حاصل کر کے سانس لیتا ہے۔ نئے اموبا پیدا کرنے کے لئے اموبا دو نئے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

دوسرے پروٹوزونس بھی اموبا کی طرح ہوتے ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ کے جسموں کے اطراف میں خوبصورت خول موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے ایسے بال ہوتے ہیں جو انہیں چلنے اور غذا حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ بہت سے پروٹوزونس دوسرے حیوانات مثلاً انسانوں کے درمیان رہتے ہیں۔ پروٹوزونس بہت سی خطرناک بیماریاں پھیلانے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ان میں ملیریا اور نیند کی بیماری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ پروٹوزون دوسرے حیوانات کی غذا کے طور پر بھی کام آتے ہیں۔ چھوٹے

سمندر کی تہہ میں موجود مختلف اقسام کے اسفنج

سمندری حیوانات ایک وقت میں ہزاروں کی تعداد میں پروٹوزونس کھاتے ہیں۔
غذا کے طور پر کام آنے والے حیوانات میں پروٹوزونس اولین حیوانات کا درجہ رکھتے ہیں۔

اسفنج۔ گھروں میں صفائی کے لئے استعمال ہونے والے اکثر اسفنج **پلاسٹک** سے بنے ہوتے ہیں، لیکن ایک اصلی اسفنج دراصل سمندر کی تہہ میں رہنے والے حیوان کے ڈھانچے پر مشتمل ہوتا ہے۔ غوطہ خور حضرات غوطہ لگا کر سمندر کی تہہ سے اسفنج بر آمد کرتے ہیں۔ یہ حضرات ڈھانچے کے ارد گرد لپٹا گوشت اتار دیتے ہیں۔ اس ڈھانچے میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ ہوتے ہیں جب اس ڈھانچے کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے تو یہ سوراخ پانی سے بھر جاتے ہیں۔

تاہم تمام اسفنج باتھ روم میں استعمال ہونے والے اسفنج کی طرح نہیں لگتے، ان میں سے کچھ اسفنج باسکٹ کی طرح کے نظر آتے ہیں جب کہ کچھ پودوں کی طرح دکھتے ہیں۔

اسفنج حرکت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ سمندر، دریا، جھیل کی تہہ میں پڑا رہتا ہے۔ اکثر اسفنج سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ چل پھر کر اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے اس لئے غذا حاصل کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسفنج کا گوشت بہت سے جدا خلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ خلیے ڈھانچے

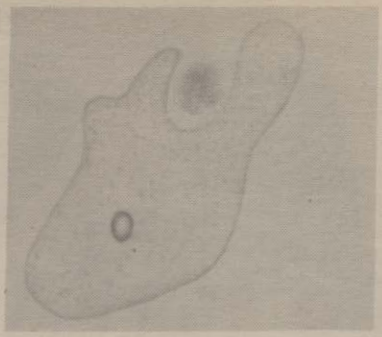

اموئبا دھتے نا غذا کو کھانے کے لئے گھیر رہا ہے

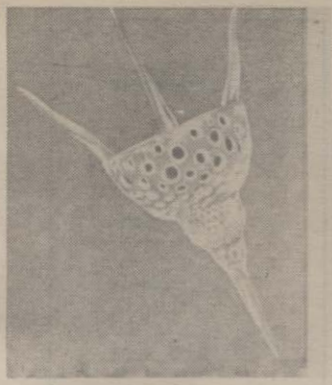

سمندر میں رہنے والے خوبصورت پروٹوزون

سے چپکے رہتے ہیں۔ ان خلیوں پر چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جو حرکت کرتے رہتے ہیں اور سوراخوں میں پانی بھرتے رہتے ہیں۔ جب پانی اسفنج سے ہو کر گذرتا ہے تو ہر خلیہ پانی میں موجود زرات کو پکڑ لیتا ہے اور پھر اسفنج اس پانی کو باہر پھینک دیتا ہے۔

اگر اسفنج کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر اس سے علیحدہ ہو جائے تو وہ اسفنج فوری طور پر اس کی جگہ دوسرا ٹکڑا پیدا کر لیتا ہے۔ بلکہ اگر آپ کسی اسفنج کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں تو یہ ٹکڑے ایک بار پھر آپس میں مل کر ایک نیا اسفنج بنالیں گے۔

شیل فش کے علاوہ اکثر سمندری جانور اسفنج کو کھانے سے کتراتے ہیں۔ بہت سے جانور مثلاً کیکڑے وغیرہ اسفنج کو اپنی حفاظت کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ان میں رہتے بھی ہیں۔

ماسٹر صاحب! بچّے کے والد سے کہہ رہے تھے "آپ کا بچہ حساب میں بہت کمزور ہے۔ میں نے کل اس سے پوچھا کہ میں دو انڈے کامران کو دوں اور چار خالد کو تو بتاؤ میں نے کل کتنے انڈے دیئے۔" آپ کے بچّے نے شرما کر کہا "آپ انڈے دے ہی نہیں سکتے"

عاطف (عزیز سے) میرے ابّو اتنے بہادر ہیں جتنا شیر۔ اتنے طاقت ور ہیں جتنا گینڈا۔ اتنے اونچے ہیں جتنا زرافہ، اتنے تیز رفتار ہیں جتنا چیتا، ان کی آنکھیں اتنی تیز ہیں جتنی عقاب کی اور وہ اتنے چالاک ہیں جتنی لومڑی۔

عزیز: "وہ کس چڑیا گھر میں ہیں"

کراچی سے عبدالقادر احمد کا انتخاب

معمار

سلمان غزالی

سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ گرمی اس شدت کی پڑ رہی تھی گویا آسمان سے آگ برس رہی ہو۔ تمام لوگ گرمی سے بچنے کے لئے اپنے گھروں میں دُبکے ہوئے تھے اور شہر ویران ویران سا

لگ رہا تھا۔ ماڈل کالونی کی گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ ایسے میں ایک گھر کا دروازہ کھلا۔ ایک دس بارہ سال کی سنہرے بالوں والی بچی نے پہلے گلی میں جھانکا اور پھر باہر نکل آئی۔ تھوڑی دور جاکر وہ ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ لڑکی نے نہایت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ گویا

دروازہ کھولنے والا پہلے سے انتظار میں تھا۔ نمودار ہونے والی لڑکی بھی پہلی لڑکی کی ہم عمر دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک پانچ چھ سال کا بچہ بھی باہر آ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ تینوں تیز تیز قدموں سے ایک سمت میں چل دیئے۔ دو تین گلیاں عبور کرنے کے بعد وہ ایک گلی کے موڑ پر پہنچ کر رک گئے۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ایک لفافہ چھوٹے بچے کو تھما دیا اور اسے کچھ سمجھانے لگی۔ بچہ سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا اور پھر موڑ مڑ کر دوسری گلی میں داخل ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں موڑ پر کھڑے ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ ایک گھر کے سامنے وہ بچہ رک گیا اور پیچھے مڑ کر یوں ان کی طرف دیکھنے لگا جیسے مطلوبہ گھر پہنچ جانے کی تصدیق چاہتا ہو۔ لڑکیوں نے ہاں میں سر ہلائے تو بچے نے آگے بڑھ کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا ایک ادھیڑ عمر کی عورت باہر نکلی جو چہرے سے ہی کافی بارعب دکھائی دیتی تھی۔ عورت کو دیکھ کر بچہ نہایت معصومیت سے بولا "آپ سکینڈری اسکول کی مس ہیں۔" عورت کے چہرے پر مسکراہٹ بھر گئی اور وہ بڑے پیار سے بولی "جی ہاں مگر آپ کو مجھ سے کیا کام ہے۔" "جی وہ میں..... آپ کو یہ دینے آیا تھا۔" یہ کہہ کر بچے نے لفافہ عورت کے ہاتھ میں تھما دیا۔ عورت نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک کارڈ نکلا۔ پہلے تو وہ حیران ہوئی مگر فوراً ہی حیرت کی جگہ مسکراہٹ نے لے لی۔ عورت نے آگے بڑھ کر بچے کو پکڑ لیا جو مڑ کر واپس جا رہا تھا اور بولیں۔ "صائمہ اور عائشہ کہاں ہیں وہ خود کیوں نہیں آئیں۔" بچہ جو سہم گیا تھا پہلے جھجکا پھر گلی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "ٹھیک ہے انہیں بلا کر لاؤ میرے پاس۔" عورت نے موڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مگر وہ نہیں آئیں گی۔ وہ ڈرتی ہیں" بچے نے جواب دیا۔ "تم انہیں کہو کہ میڈم کا حکم ہے فوراً آئیں۔" میڈم اسے چھوڑتے ہوئے بولیں۔ چھوٹتے ہی بچہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگا اور سیدھا صائمہ اور عائشہ کے پاس جا کر رکا "کیا ہوا دے دیا کارڈ" عائشہ نے بے تابی سے پوچھا۔

میڈم نے تم دونوں کو بلایا ہے" بچہ سانس درست کرتے ہوئے بولا۔ دونوں لڑکیوں کے چہروں کے رنگ ایک دم اڑ گئے۔ "مروا دیا تم نے کس نے کہا تھا کہ ایسی ہٹلر جیسی میڈم کو کارڈ بھیجو" صائمہ غصے سے سنہرے بالوں والی عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے تو اپنی طرف سے اچھا کیا تھا۔" عائشہ دھیرے سے بولی۔

"ہونہہ بڑی آئی اچھا کام کرنے والی مجھے بھی پھنسوا دیا۔ بڑی ہمدردی تھی میڈم سے کہ ان کی زندگی بڑی بور ہے۔" صائمہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے اگر ایسی بات تھی تو مت دیتی میرا ساتھ۔" عائشہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"اچھا اچھا اب بس کرو اور چلو کہیں میڈم ناراض نہ ہو جائیں" صائمہ نے کہا اور دونوں میڈم کے گھر

کی طرف یوں چلنے لگیں جیسے بندوق کی زد پر ہوں۔ بچہ پہلے ہی اپنے گھر کا رخ کر چکا تھا۔ دونوں میڈم کے گھر کے سامنے پہنچیں تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور میڈم سامنے رکھے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ میڈم نے ان کو اشارے سے اندر بلایا اور دوسرے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گئیں۔ میڈم کارڈ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے بولیں " پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ میری سالگرہ کا تمہیں پتہ کیسے چلا۔ " اسکول کے برعکس یہاں میڈم کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ دونوں لڑکیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔

عائشہ بولی " وہ مس زبیدہ مس نیلوفر کو بتا رہی تھیں تو میں نے سنا تھا۔ آج آپ کی سالگرہ ہے۔ "

میڈم نے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

"اچھا مگر تم دونوں خود کیوں نہیں آئیں کارڈ دینے؟" میڈم نے اسی طرح پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

" دراصل میڈم ہم ڈر رہے تھے کہ آپ بہت سخت ہیں اس لئے ناراض نہ ہو جائیں " اس دفعہ صائمہ ہمت کر کے بولی۔ میڈم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھ کر صائمہ اور عائشہ کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور پیار سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ " دیکھو بیٹا استاد سخت ہوتے ہیں، ڈانٹتے ہیں مگر صرف بُرے اور نافرمان بچوں کو..... بلاجواز وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتے اور پھر آپ تو اتنا اچھا کام کر رہی تھیں اس میں بھلا ڈرنے والی کیا بات تھی۔ اچھے بچے بڑوں کی عزت کرتے ہیں مگر وہ کسی سے ڈرتے نہیں " اتنا کہہ کر میڈم اٹھ کھڑی ہوئیں "اچھا اب تم دونوں بیٹھو میں تمہارے لئے ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔ " یہ کہہ کر میڈم اندر چلی گئیں۔ میڈم کے جاتے ہی عائشہ صائمہ سے مخاطب ہوئی " دیکھا میڈم کتنی اچھی ہیں ہم بلاوجہ ہی خوفزدہ تھے۔ " " ہاں یہ بات تو ہے " صائمہ نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

" میڈم واقعی ہی بہت پیار سے ملیں مگر ایک بات بہت افسوس ناک ہے کہ میڈم کی زندگی کتنی بور اور بے مقصد ہے۔ بے چاری بالکل پھیکی زندگی ہے۔ میں نے تو میڈم کو کبھی لوگوں سے زیادہ ملتے بھی نہیں دیکھا۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا سارا دن اسکول میں بچوں کو پڑھانا گھر میں پڑھانا اور اپنے کاموں میں مصروف رہنا۔ اپنا سارا وقت دوسروں کے لئے وقف کر دینے کے باوجود کوئی انہیں جانتا تک نہیں۔ بھئی میں تو کبھی بھی استاد نہ بنوں " عائشہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

" ہاں واقعی ایسی زندگی کا کوئی فائدہ نہیں " صائمہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

" انسان اگر بنے تو ڈاکٹر شمیم کی طرح۔ تم نے دیکھا تھا رات کو ٹی وی پر آئیں تھیں، کتنی عزت ملی تھی انہیں۔ اتنی کم عمری میں ہی اتنی مشہور ہو گئی ہیں۔ " " ہاں یا پھر جمیلہ انیس کی طرح ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہی ہٹ ہوا اور ملک کا ہر شخص انہیں پہچاننے لگا ہے۔ " صائمہ سر ہلاتے ہوئے بولی اور پھر دونوں

ملک کی مشہور شخصیتوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں۔ اصل موضوع وہی میڈم کی پھیکی زندگی سے موازنہ کرنا تھا۔ میڈم شربت ٹرے میں رکھے اندر داخل ہوئیں تو دونوں خاموش ہو گئیں۔ میڈم نے ٹرے میز پر رکھی اور بیٹھنے ہی لگی تھیں کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ میڈم دروازہ کھولنے چلی گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ڈاک تھی جس میں کئی کارڈ "سالگرہ مبارک" کے تھے۔ صائمہ اور عائشہ شربت پینے لگیں۔ میڈم کارڈ دیکھ رہی تھیں۔ صائمہ نے یونہی ایک کارڈ اٹھالیا اور دیکھنے لگی کارڈ پر لکھا تھا۔

"سالگرہ مبارک" "اس عظیم ہستی کو جس نے مجھے اس قابل بنایا جو میں آج ہوں" فقط "ڈاکٹر شمیم انصاری۔"

دوسری طرف معذرت لکھی تھی کہ میں مصروفیت کی وجہ سے خط نہیں لکھ سکی مگر جلد ہی ملنے آؤں گی۔ ڈاکٹر شمیم انصاری کا نام پڑھ کر صائمہ کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر میڈم خود ہی سمجھ گئیں اور بولیں "یہ میری شاگرد تھی۔ اب تو بہت مشہور ہو گئی ہے۔ مجھے ملنے آتی ہے اور کارڈ بھی بھیجتی ہے۔ میڈم نے دونوں کو اپنے بہت سے شاگردوں کے بارے میں بتایا جو اب بڑے عہدوں پر فائز تھے اور کافی نام کما چکے تھے۔ دونوں لڑکیاں بڑے شوق اور انہماک سے بیٹھی سن رہی تھیں۔ صائمہ نے پوچھا "میڈم تو یہ لوگ اتنا مشہور ہونے کے بعد بھی آپ کو خط لکھتے ہیں اور ملنے آتے ہیں" "کیوں نہیں بیٹا ان میں اکثر تو آج بھی یہ کہتے ہیں کہ میڈم ہم آج جو کچھ ہیں آپ ہی کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہیں۔"

"کسی بھی مشہور اور باصلاحیت شخص کو سنوارنے اور صلاحیتوں کو نکھارنے والے ہاتھ استاد ہی کے ہوتے ہیں اور ترقی یافتہ ملکوں میں آج بھی لوگ تقریبوں اور پارٹیوں میں اپنے استاد کی شرکت باعث اعزاز سمجھتے ہیں۔" "میڈم اگر آپ کے شاگرد اتنے مشہور اور بڑے بن گئے ہیں تو کیا میں بھی ان کی طرح مشہور ہو سکتی ہوں" صائمہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "کیوں نہیں، جانتی ہو ڈاکٹر شمیم میری سب سے نالائق شاگرد تھی مگر میں نے کبھی اسے ہمت نہیں ہارنے دی، جس کے نتیجے میں آج وہ اتنی بڑی ڈاکٹر ہے اور اس بات کو وہ آج بھی نہیں بھولی" میڈم کی بات سن کر صائمہ کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا وہ بولی "پھر تو میں بھی ڈاکٹر شمیم کی طرح بنوں گی" "نہیں ہم ڈاکٹر شمیم کی طرح نہیں بنیں گی" عائشہ بولی تو میڈم اور صائمہ اسے حیرت سے دیکھنے لگیں۔ عائشہ نے میڈم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑے عزم سے بولی "ہم ڈاکٹر شمیم سے زیادہ بڑے انسان بنیں گے۔ ہم استاد بنیں گے بالکل میڈم کی طرح" صائمہ کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا "واقعی بالکل میڈم کی طرح" اور میڈم نے پُرنم آنکھوں سے دونوں کو گلے لگا لیا۔

لباس

غلام عباس طاہر

نگر نگر کے ملبوسات کے

بارے میں دلچسپ معلومات

انسان نے لباس کئی وجوہات کی بنا پر ایجاد کیا۔ شرم و حیا کا جذبہ اور موسمی حالات سے بچاؤ کی ضرورت دو بڑے اسباب تھے لیکن جب انسان ذرا متمدن ہوا تو اس نے لباس کو بدن کی خوبصورتی اور سجاوٹ کا ذریعہ بنالیا اور پھر مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے انسانی لباس نے دو واضح صورتیں اختیار کیں۔ سرد ملکوں کا لباس بھاری بھرکم مگر چست..... اور گرم ملکوں کا ہلکا پھلکا اور ڈھیلا ڈھالا۔ سرد ملکوں میں پتلون کا رواج روم سے ہوا۔ مختلف ادوار میں جس کی شکلیں بدلتی رہیں۔ اسی زمانے میں گرم خطے میں رہنے والے لباس سے بدن ڈھانپنے کے بجائے جسم کو خوبصورت بنانے کے مختلف تجربے کر رہے تھے۔ وہ مختلف زیور مثلاً بازو

بند، پازیب، گلو بند، کانوں کی بالیاں اور نتھ استعمال کرتے تھے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ زیور لباس سے پہلے ایجاد ہوئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پتلون لنگوٹی ہی کی جدید شکل ہے۔ کیونکہ لنگوٹی کا استعمال قدیم زمانے سے ہونے لگا تھا۔ انسان جب لباس تیار کرنے میں ماہر ہو گیا تو مختلف طبقوں کے لئے مختلف لباس وجود میں آنے لگے۔ بہت سے پیشہ ور گروہ لباس سے پہچانے جانے لگے۔ تاہم گرم ممالک کے معاشرے نے لباس کی سادگی برقرار رکھی۔

امریکہ کے مایا قبائل کے فرد عموماً سادہ سی برجس پہنتے۔ اس میں کندھوں کے گرد گانٹھیں لگانا پڑتیں، اس کے ساتھ آرائشی پٹی بھی لگاتے جو حیثیت کو ظاہر کرتی تھی۔ ان کی عورتیں عموماً ٹاٹ جیسا کھردرا کپڑا استعمال میں لاتیں۔ مصر شام اور عراق کی مہذب اقوام کا لباس بھی سادہ تھا۔ مصر کے قدیم بادشاہی زمانے میں امیر لوگ سفید لینن کا غرارہ نما کپڑا (Kilt) پہنتے تھے۔ بادشاہت کے درمیانی دور میں یہ پوشاک ذرا اور لمبی ہوئی اس کے ساتھ زیر پاجامہ اسکرٹ کا استعمال ہونے لگا۔ جدید دور میں بادشاہت میں چھوٹی قمیص نے رواج پایا۔ مصری عورتیں ڈھیلا ڈھالا ریشمی لباس پہنتیں۔ زنانہ لباس کی وضع قطع بدلتی رہی لیکن مردانہ لباس مدت تک قدیم ہی رہا۔ مصر و شام کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ جسم کے کسی حصے پر ایک بال بھی نہ چھوڑتے۔ کوئی سخت کام کرنا ہوتا تو تمام کپڑے اتار دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انسان زیادہ کام کر سکتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ گرم خطوں کے باسیوں کو زیادہ کپڑے نہیں پہننا چاہئیں کیونکہ ان کے تقاضے سرد ممالک کے باشندوں سے یکسر مختلف ہیں۔ صحرائی علاقوں میں چرغے کا لباس پہنا جائے۔ ایک طرف وہ بدن کو تپش سے بچائے گا دوسری طرف پسینہ جذب کر لے گا۔ گرم ممالک میں یورپی طرز کا چست لباس اس لئے بھی تکلیف دہ ہے کہ اس سے مختلف بیماریاں پھیلنے کا اندیشہ ہے یعنی قمیص تنگ ہو تو پسینہ خشک نہیں ہوتا اس سے فاسد مادہ پیدا ہو گا جراثیم کی افزائش ہوگی۔ اس سلسلے میں لباس کے ایک ماہر کو تلخ تجربہ ہو چکا ہے..... کئی سال قبل وہ مشرقی کولمبیا کی لیبارٹری میں تجربات کر رہا تھا۔ جو فنی ملازمین کام کرتے تھے ان کے پاؤں سرطان میں مبتلا رہتے۔ کئی طریقوں سے علاج کرایا لیکن ناامیدی ہوئی۔ بیماری کی اصل وجہ معلوم نہ ہوئی۔ اس علاقے میں لوگ عموماً ننگے پاؤں یا ہلکے کینوس کے سینڈل پہنتے مگر فنی ملازمین عام لوگوں پر رعب جمانے کے لئے بوٹ اور جرابیں استعمال کرتے۔ وہ ماہر خود سینڈل پہنتا تھا لمبے عرصے تک اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بیماری کی اصل جڑ جوتے اور جرابیں ہیں۔ اس نے بوٹ اور جرابیں اتروادیں پھر کسی کو تکلیف نہ ہوئی۔ یعنی گرم علاقوں میں بوٹ اور جرابیں نقصان دہ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قباحت یہ ہے کہ گرم خطوں کے لوگ مغربی تہذیب کی اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں۔ خود سرکاری سطح پر کوشش ہوتی ہے کہ لوگ مغربی طرز کے جوتے پہنیں خواہ پاؤں گل ہی جائیں۔ بعض ملکوں میں

قانون ہے کہ سڑک سے گزرتے وقت ہر شہری جیکٹ استعمال کرے۔ مغربی انجینئر اس معاملے میں حد سے بڑھ گئے ہیں وہ گرم ملکوں میں کارکنوں کے لئے ڈھیلے لباس کی سفارش کرنے کی بجائے وہاں حکومت پر زور دیتے ہیں کارخانوں میں ائیر کنڈیشنز لگوا دیئے جائیں۔ آپ کبھی فلوریڈا جائیں تو حیرت ہوگی کہ وہاں نہانے کے تالابوں کا عام رواج ہے۔ کام کرتے وقت کسی کے بدن پر قمیص نہیں ہوتی۔ اب لازماً گرم ملکوں میں پتلون اور ٹائی کا استعمال ختم ہونا چاہئے۔ یہ کسی اعتبار سے صحت مند نہیں۔ اس سے ثقافتی ملاپ بڑھنے کے بجائے تہذیبی غلامی کو فروغ ملتا ہے۔ انسان اپنے ماحول سے کٹ جاتا ہے۔ ایشیاء افریقہ کے تقاضے یورپ سے مختلف ہیں۔ ان کا خیال نہ رکھنا سنگین غلطی ہے۔ ہم تو پھر مسلمان ہیں مغربی تہذیب کیوں اپنائیں۔ اپنی تہذیب کیا بُری ہے ؟

نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے آرام کے ساتھ

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سُستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں نگلنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچّوں کی طرح... آئیے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنائیے۔

وزارتِ صحت اسلام آباد کو بھی آپ سب خط لکھئے کہ حکومت سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی لگا دے۔
قومی صحت کو تباہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی بھی ضروری ہے۔

وزیر تعلیم صاحب۔ ہمارے حال پر رحم فرمائیے

میں نے پچھلے سال اپریل میں میٹرک کا امتحان دیا۔ اگست میں میرا رزلٹ آیا میں نے ۶۹ فیصد نمبر حاصل کر لئے۔ پھر میں دوسرے تمام طالبعلموں کے ساتھ کالجوں میں داخلے کا انتظار کرنے لگی کوئی پانچ یا چھ ماہ بعد کالجوں میں داخلے شروع ہوئے اور میرا اپنے پسندیدہ کالج میں گورنمنٹ کوٹے پر داخلہ ہو گیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت میرا کیا حال ہو گا۔ ؟ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کل ہی سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کر دوں۔ مگر میں اور میرے تمام ساتھیوں کے ذہنوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ کالج کے اساتذہ نے ہڑتال کر دی ہے اور پھر یہ ہڑتال کوئی تین ماہ جاری رہی پھر کالج کھلے اور وہ بھی اس طرح کہ بہت سے اساتذہ نے اپنا دیدار بھی نہیں کرایا اور کوئی پندرہ دن بعد اساتذہ نے پھر ہڑتال کر دی مختصر یہ کہ ہمارے کالجوں میں کوئی تین یا چار ماہ پڑھائی ہوئی اور پھر امتحانوں کی تاریخ آ گئی۔ مگر ابھی ہمارا ایک ہی پرچہ ہوا تھا کہ شہر کے حالات کی بناء پر کالجوں کے امتحانات آگے بڑھا دئے گئے اور کوئی ایک ماہ بعد پھر شروع ہوئے۔ اور جولائی میں ختم ہو گئے۔

میرے کہنے کا مقصد ہے کہ اپریل ۸۹ سے جولائی ۹۰ تک ایک سال اور تین ماہ میں طلبہ کی تعلیم یہی کوئی پانچ ماہ ہوئی ہو گی اور باقی دس ماہ وہ فارغ رہے اور اپنے فارغ اوقات سے تنگ آ کر بہت سے طالبعلموں نے کلاشن کوفوں اور سیاسی تنظیموں کا سہارا لیا۔ میرے خیال میں اگر طالبعلموں کو اتنا فارغ وقت نہ دیا جائے اور انھیں مسلسل تعلیم میں مصروف رکھا جائے تو شاید ملک کے حالات کافی حد تک سدھر جائیں امید ہے کہ آپ اس جانب توجہ دیں گے۔

اسکے علاوہ ایک بات یہ کہ کالجوں میں پڑھائی نہ ہونے کے سبب میرے جیسے کئی طالبعلموں نے ٹیوشن اور کوچنگ سینٹرز میں داخلہ لے لیا۔ کیونکہ یہ دو سال ہمارے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ اور ایک مزے کی بات یہ کہ ہمارے کوچنگ سینٹرز میں آدھے سے زیادہ اساتذہ شہر کے مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہیں اگر یہ اساتذہ کالجوں میں یہ وہ سب پڑھا دیں تو کوچنگ سینٹرز میں ہمیں جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ اب ان حالات میں غلطی کس کی ہے؟ اساتذہ کی ؟ یا حکومت کی؟ میرے خیال میں دونوں کی..... اور دونوں کو اپنی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے اس غلطی کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میں امید کرتی ہوں کہ آپ ان مسائل کو حل کرنے کی بھرپور اور فوری کوشش کریں گے۔ اس سے بہت سے طلبہ کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔

(منیزہ صدیقی۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

ثمینہ ظفر

یہ انتظار کب ختم ہوگا

صبح سات بجے کا وقت تھا...... معمول کے مطابق سردی اپنے زوروں پر تھی۔ مگر سخت سردی کے باوجود لوگ اپنے اپنے کام کی جانب رواں دواں تھے۔ ایسے میں سڑک پر ایک بوڑھا شخص اپنی چھڑی گھماتا ہوا خراماں خراماں چلتا آرہا تھا۔ یہ مسٹر ہیری تھے جو کہ سرخ و سفید لمبے قد کے مالک تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور رعب دار تھیں اور انکے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اگرچہ ان کی عمر زیادہ تھی مگر اپنی عمر سے کم ہی نظر آتے تھے۔ ان کو صبح کی سیر کا بے حد شوق تھا...... گرمیاں ہوں یا سردیاں۔ صبح کی تازہ ہوا کھانا ان کا معمول تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے تو ان کی ملاقات ننھے صائب سے ہوئی جو اپنے کتے "جوجی" کے ساتھ تھا۔ یہ ایک پاکستانی بچہ تھا۔ بے حد ذہین اور ہوشیار تھا۔

"ہیلو مسٹر ہیری کیا حال ہے؟" صائب شوخی کے انداز میں بولا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سکول جارہے ہو؟" مسٹر ہیری بولے۔

"جی۔" صائب یہ کہہ کر اپنی سائیکل پر سوار ہوا اور یہ جا وہ جا۔

مسٹر ہیری صائب کے سامنے والے گھر میں رہتے تھے۔ اس گھر میں تنہا تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال تقریباً پانچ چھ سال قبل ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ بیٹی جرمنی میں رہتی تھیں جبکہ بیٹا اپنی بیوی اور بچے سمیت دوسرے گھر میں رہتا تھا۔ مسٹر ہیری دو تین سال قبل اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے البتہ ان کو جو پنشن ملتی تھی ان سے انکی گذر بسر ہو جاتی تھی۔ مسٹر ہیری صائب سے بہت پیار کیا کرتے تھے وہ اکثر و بیشتر انکے گھر آجاتا اور کچھ وقت گذار کر چلا جاتا۔ صائب کی وجہ سے اُنکا دل لگا رہتا تھا یا کبھی کبھی انکا بیٹا یا کوئی دوست ان سے ملنے آجاتا تھا۔

آج شام کو صائب اپنے جوجی (کتے) کو لیکر مسٹر ہیری کے گھر پہنچا۔ بیل پر اس نے ہاتھ رکھا تو تقریباً ایک منٹ بعد ہٹایا۔ مسٹر ہیری بڑبڑاتے ہوئے آئے اور دروازہ کھولا لیکن صائب کو دیکھ کر انکے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ہیری! آج کیا کھیلیں؟" صائب نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔

" آج ہم کرکٹ کھیلیں گے۔" مسٹر ہیری چہک کر بولے۔ جیسے صائب کے آنے سے انکی ساری اداسی دور ہو گئی ہو۔

"واقعی آج تو بہت مزا آئے گا۔ پچھلی دفعہ بھی میں نے آپ سے زیادہ رنز بنائے تھے۔ آج بھی میں ہی جیتوں گا۔"

کرکٹ کھیلنے کے بعد صائب مسٹر ہیری کو خدا حافظ کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ مسٹر ہیری اپنے آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ صائب کے جانے کے بعد وہ پھر اداس ہو گئے۔ ایک دفعہ پھر وہ ماضی میں چلے گئے۔ آج ان کو اپنی بیوی اور بچے شدت سے یاد آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں بے حد غمناک تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھی صائب کی طرح ایک چھوٹا سا بچہ بن جائیں۔ جس کو دنیا کا کوئی غم و فکر نہ ہو جس کی خواہشیں بے حد معصوم ہوں۔ جب سے ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا تب سے وہ اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انکے بیٹے جم کی بیوی "سارا" ان کا خیال نہ رکھتی تھی۔ ہر وقت ان سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ اگرچہ مسٹر ہیری نے اس کے ساتھ بُرا سلوک نہ کیا تھا۔ ایک دفعہ مسٹر ہیری نے سنا کہ "سارا" اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی کہ اب مجھے ننھے رابرٹ کا خیال ہے جو ہر وقت اس بوڑھے سے چمٹا رہتا ہے۔ میں کسی صورت بھی اس بیمار بوڑھے کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ اس بڈھے کو کسی اولڈ ہاؤس میں چھوڑ آؤ۔ مسٹر ہیری کو اپنے بیٹے اور بہو کے رویئے پر بے حد افسوس ہوا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ناکارہ شے ہوں۔ ایک دن تو حد

ہو گئی۔ مسٹر ہیری سے ایک کپ ٹوٹ گیا۔ سارا نے گھر میں وہ غُل مچایا جس کی انتہا نہیں اور آخری فیصلہ سنا دیا کہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ بالآخر جم کو نیا مکان لینا پڑا۔ کیونکہ مسٹر ہیری نے اس گھر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ ان کی ذاتی ملکیت تھی۔ کتنے ماہ و سال بیت گئے اس عرصہ میں ننھا رابرٹ بھی کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ اب ان کا بیٹا جم صرف کرسمس کو اپنے پاپا سے ملنے کے لئے آتا تھا۔ اب تو کرسمس کا تہوار بھی آنے والا تھا۔ گھر گھر کرسمس کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں مگر مسٹر ہیری بے حد اداس تھے۔ اس اداسی نے انھیں بیمار کر ڈالا تھا۔ جب وہ دو تین دن تک صائب کو نظر نہ آئے تو پریشان ہوا اور ان کو دیکھنے کے لئے گھر چلا گیا۔ اس کو ان کی حالت پر بڑا رحم آیا۔

۲۵ دسمبر، مسٹر ہیری کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ آج ان کو اپنے پوتے رابرٹ کا انتظار تھا کہ کب وہ ان سے ملنے کے لئے آئے گا۔ ادھر صائب تیار ہو کر جب مسٹر ہیری کے گھر پہنچا تو دیکھا وہاں تو بہت رونق تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مسٹر ہیری کا بیٹا آیا ہوا ہے۔ مسٹر ہیری صائب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیونکہ آج ان کے سامنے دو دو معصوم بچے تھے۔ مسٹر ہیری بولے "آؤ بیٹا۔ دیکھو میرا رابرٹ آیا ہے۔ تمہیں اس سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ آؤ اس سے ملو۔"

اس چھوٹی سی ملاقات میں ان دونوں کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ صائب نے رابرٹ سے پوچھا، "تمہیں اپنے دادا اچھے نہیں لگتے۔" رابرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صائب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بولا "کاش میرے دادا بھی زندہ ہوتے تو میں ان سے خوب کھیلتا"۔

اچھا! میری ماما تو کہتی ہیں کہ "بوڑھے لوگ اچھے نہیں ہوتے، انہیں اولڈ ہاؤس چھوڑ آنا چاہئے۔" صائب بولا "تمہارے دادا تم سے بہت پیار کرتے ہیں وہ ہر وقت تمہاری باتیں کرتے رہتے تھے کیا تم ان کے پاس آ نہیں سکتے۔"

رابرٹ بولا "نہیں میری امی ناراض ہوں گی۔" رابرٹ اس کے پاپا اور اس کی مما کے جانے کے بعد مسٹر ہیری پھر ہمیشہ کی طرح اکیلے ہو گئے۔ اگرچہ مسٹر ہیری کے دل میں جینے کی کوئی رمق باقی نہ رہی تھی مگر وہ صائب کی وجہ سے زندہ تھے اور اس امید پر کہ اگلے سال پھر ان کا رابرٹ ان کو "میری کرسمس" کہنے کے لئے آئے گا اور وہ تمام سال اسی جملے کے سہارے زندہ رہیں گے۔ مسٹر ہیری کس قدر معصوم تھے جو صرف اس جملے اور دن کے لئے برسوں جینے کے لئے تیار تھے۔

صائب کا ننھا ذہن سوچ رہا تھا کہ جب تک میں یہاں ہوں میں مسٹر ہیری کو اداس نہیں ہونے دوں گا۔ یہ سوچ کر وہ مسٹر ہیری کے گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

مقابلۂ مصوّری

ہم نے اپنی گزشتہ خصوصی اشاعت "دل دل پاکستان" میں ملک بھر کے تمام طالب علم ساتھیوں کے لئے مصوری کے ایک مقابلے کا اعلان کیا تھا جس کا موضوع تھا۔

"اگرچہ خاک تک اس ملک کی سرمہ ہے آنکھوں کا" مجھے لیکن وطن کی یہ ادا بے حد پسند آئی"۔ وطن عزیز کے سینکڑوں بچوں نے اپنے وطن کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور ہر حوالے سے نہ صرف اسے پسند کیا بلکہ بے پناہ محبت اور عقیدت کا اظہار بھی کیا۔ ساتھیوں کی بنائی ہوئی خوبصورت تصاویر میں سے بہترین کا انتخاب خاصا مشکل کام تھا۔ اس لئے ہم نے اس کا حل یہ نکالا کہ تمام تصاویر یکجا کر کے پاکستان کے دو بڑے آرٹسٹوں جناب گل جی اور جناب آفتاب ظفر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ان دونوں صاحبان نے ایک ایک تصویر کو محبت سے دیکھا۔ انصاف کے ترازو میں تولا اور نتیجہ ہمارے سپرد کر دیا۔ ہم یہ نتیجہ یہاں شائع کر رہے ہیں اور یکساں نوعیت کے انعام حاصل کرنے والے ساتھیوں کو دلی مبارک باد پیش کر رہے ہیں۔

مقابلے کی وہ تمام تصاویر بھی بے حد خوبصورت ہیں جو بدقسمتی سے انعام حاصل نہ کر سکیں سوائے ان چند تصاویر

شہناز پروین، کراچی

محفوظ احمد، ٹنڈو آدم

ارم حسن ، راولپنڈی

کے جو ٹریس کی گئی ہیں۔ ہو بہو نقل کی گئی ہیں یا پھر بیرونی کلچر کی نمائندہ ہیں۔ جن تصاویر کو انعامات کے قابل سمجھا گیا ہے وہ اوریجنل ہیں اور بنانے والے کے اپنے تصور اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں۔

(۱) الماس پیار علی ، کراچی
(۲) عزیزہ ، کراچی
(۳) دانیہ جبار ، کراچی
(۴) شہزاد علی شاہ ، سیالکوٹ
(۵) رانی سبیتا سندرس ، کراچی
(۶) فاروق احمد پیرزادہ ، پاکپتن شریف
(۷) محمد حسین ، لاہور
(۸) زینب اختر بٹ ، دوحہ قطر
(۹) محفوظ احمد ، ٹنڈو آدم
(۱۰) ارم حسن ، راولپنڈی
(۱۱) شہناز پروین ، کراچی

MASS

کمسن قلم کار

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

ننھی نگارشات کی جگہ اب کم سن قلم کار نے لی ہے۔ آپ اگر واقعی کم سن ہیں تو مختصر تحریروں کا یہ سلسلہ آپ ہی کے لئے ہے۔ یاد رہے کہ صاف، خوشخط اور مختصر ترین تحریریں جلد شائع ہوسکیں گی۔ جس تحریر کی پشت پر قلم کار کا نام پتا درج نہ ہوگا اُسے مایوسی ہوگی۔ نقل شدہ تحریروں کی سزا "بلیک بکس" برقرار رہے گا۔ کم سن قلم کار چاہیں تو اپنی تحریروں کے ساتھ اپنی تصاویر بھی بھجوا سکتے ہیں۔ تصویر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ قلم کار ساتھی آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا نوٹس بورڈ وقتاً فوقتاً ضرور پڑھتے رہا کریں۔ کم سن قلم کار میں شائع ہونے والی تحریروں کو آنکھ مچولی کی اعزازی کاپی روانہ کی جائے گی۔

(ادارہ)

تتلی

اورنگزیب عالمگیر۔ چکوال

پھولوں کے جھرمٹ میں چھپ کر — اپنی جان بچائے تتلی
سات رنگوں کی پیاری تتلی — باغ کی راج دُلاری تتلی
جب بھی باغ میں آئے تتلی — دل کو خوب لُبھائے تتلی
بچے اس کو پکڑنا چاہیں — لیکن ہاتھ نہ آئے تتلی
چڑیا اس کے پیچھے لپکے — جلدی سے اُڑ جائے تتلی
اُدھر سے بچے اِدھر سے چڑیا — ایسے میں گھبرائے تتلی

ماں کے آنسو

نوید احمد۔ جھنگ صدر

"یہ پڑا ہے بستہ، میں آج سے اسکول نہیں جاؤں گا۔" ثاقب نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی امی جان سے کہا۔

"کیا ہوا ہے بیٹے، اچھا بھلا تو، تو اسکول گیا تھا۔ پھر اب کیا سوجھ گئی۔ کیا کسی سے جھگڑا ہوا ہے" اس کی ماں نے پوچھا۔

"نہ تو میرے پاس اچھے کپڑے ہیں، نہ نئی کتابیں، نہ جوتے، نہ جیب میں پیسے ہوتے ہیں کہ میں تفریح میں کچھ کھا پی سکوں۔" ثاقب کے چہرے پر زمانے بھر کی مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

"میں صرف ایک شرط پر پڑھنے جاؤں گا جب آپ مجھے یہ سب چیزیں مہیا کر دیں گی۔"

"مگر بیٹے میرے پاس اتنے پیسے" ثاقب کی امی نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کے جملہ کے مکمل ہونے سے پہلے ثاقب بول پڑا۔

"بس پھر میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا۔" ثاقب یہ کہہ کر پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی ماں دیکھتی ہی رہ گئی، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اتنا کام کاج صرف اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل ہی کے لئے تو کرتی تھی۔ اس کا لعل وہ کچھ مانگ رہا تھا جو وہ اسے نہیں دے سکتی تھی۔ سر کو جھٹکتے ہوئے وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ شام کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کا بے قراری سے انتظار کر رہی تھی۔ جونہی شام ڈھلے ثاقب گھر میں داخل ہوا، اس کی ماں چونک اٹھی۔ ثاقب کے کپڑوں پر جگہ جگہ سیاہ دھبے لگے ہوئے تھے، اس کے ہاتھ میں چند مڑے تڑے نوٹ تھے۔

"کہاں سے آئے ہو، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔؟" ثاقب کی ماں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں ورکشاپ سے آرہا ہوں، میں نے وہاں کام کیا ہے، یہ دیکھ کتنے پیسے ہیں میرے پاس" ثاقب نے اپنی مٹھی کھول دی۔ ماں نے یہ دیکھا تو تکلیف کے مارے اس کے منہ سے آہ نکل گئی اور اس نے دوڑ کر ثاقب کو اپنے سینے سے لگالیا۔ کچھ دیر بعد ثاقب نے ماں سے جدا ہو کر ان کے چہرے کو دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں اداسی تو تھی مگر آنسو نہ تھے۔ ثاقب نے اپنے والد کے بعد سے اپنی ماں کو کبھی روتے نہ دیکھا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ثاقب ورکشاپ جاتا رہا۔ ایک دن ثاقب ورکشاپ میں کام کر رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار ورکشاپ میں آیا، ثاقب اسے دیکھتے ہی

اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے ادب سے سلام کرتے ہوئے نظریں جھکالیں۔

"چلو اٹھو تم آج سے اسکول جاؤ گے۔" ثاقب کے ساتویں جماعت کے ماسٹر صاحب نے کہا۔

"ماسٹر صاحب مگر" ثاقب نے کچھ کہنا چاہا۔

"بیٹے تمہاری امی میرے پاس آئیں تھیں وہ بہت فکرمند تھیں، کیا تمہیں اپنی ماں کا کوئی احساس نہیں۔ اگر تمہاری ماں امیر ہوتیں تو وہ تمہیں دنیا کی ہر آسائش لے کر دیتیں، مگر وہ تمہیں سوائے دعاؤں کے اور کچھ نہیں دے سکتیں اور پھر تم نے تو پڑھا ہے ماں کے قدموں کے تلے جنت ہے، کیا تم اپنی جنت سے محروم ہونا چاہتے ہو۔ اب بھی اگر تم پر کوئی اثر نہیں ہوا تو میں چلتا ہوں۔"

ثاقب کی طرف سے کسی ردعمل کو نہ دیکھ کر ثاقب کے ماسٹر صاحب تیزی سے باہر نکل گئے۔ ثاقب گم سم کھڑا رہا، اس نے سر کو جھٹکا دیا اور دوبارہ اوزار اٹھا کر کام کرنے لگا۔ اب اسے اسکول چھوڑے پانچ ماہ ہو چکے تھے۔ امتحان اب سر پر آن پہنچے تھے۔ اس کی ماں کو یہی فکر تھی کہ کہیں ثاقب کا ایک سال ضائع نہ ہو جائے۔ ثاقب بہت ذہین تھا۔ ثاقب کی ماں کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر ثاقب اب بھی سیدھے راستے پر آجائے تو وہ امتحان دے سکتا ہے، کیونکہ تمام مضامین اسے اچھی طرح یاد تھے۔ وہ دن رات محنت کرنے والا لڑکا تھا۔ بس ایک زمانے کی تیز روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ امیر لڑکوں کو خوب صورت کپڑے اور جوتے پہنے دیکھ کر وہ مایوسی کا شکار ہو گیا تھا۔

ثاقب ایک شام گھر میں داخل ہوا، اس کے کپڑے روز کی طرح کالے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑا، اس کی ماں ہاتھ میں نیا بستہ اور یونیفارم لئے کھڑی تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا تو یک دم اس کا دل دہل گیا، اس کا جسم کانپنے لگا اور ایک لمحہ میں اس نے اسکول جانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے۔ موٹے موٹے آنسو۔ ثاقب دوڑ کر ماں کے قدموں سے لپٹ گیا۔ ثاقب کی گردن پر ماں کی آنکھوں سے آنسو گرے تو ثاقب نے محسوس کیا کہ خوشی کا ایک انوکھا احساس سر سے پاؤں تک اس کے جسم میں رچ بس گیا ہے۔

معلومات قرآن پاک

مرسلہ۔ محمد خالد اکرم۔ ملتان

(۱)..... باب القرآن قرآن پاک کی کس سورۃ کو کہا جاتا ہے؟

(۲)..... قرآن پاک کا روسی ترجمہ کس نے کیا؟

(۳)..... قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ کا نام بتائیے؟

(۴)..... حضور اکرمؐ کو کس سورۃ کے ذریعے اعلانیہ تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا؟

(۵)..... بتائیے شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے اردو ترجمہ میں قرآن کا کیا نام رکھا؟

جوابات:-

(۱)..... سورۃ فاتحہ (۲)..... جمال الدین افغانی

(۳)..... سورۃ البقرہ (۴)..... سورۃ مدثر

(۵)..... موضح القرآن

ننھی شہناز

عبدالستار اثر، سرگودھا

ننھی مُنّی پیاری پیاری
سارے گھر کی راج دلاری
پڑھتی ہے پنجوقت نماز
نام ہے اُس کا بی شہناز

جاتی ہے ہر روز اسکول
پڑھنا لکھنا ہے معمول
کہتی ہے سب بچّوں کو
لکھنا اور پڑھنا سیکھو
آؤ بھائی کام کرو
پیدا اپنا نام کرو

بجلی

شہزاد التمش۔ کراچی

آج سے ایک سو سال پہلے بجلی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ کوئی کام ایسا نہیں جو بجلی نہ کر سکتی ہو۔ یہ ایک نہایت فرمانبردار خادمہ کی طرح ہر وقت حکم کی منتظر رہتی ہے۔ بٹن دباتے ہی یہ کام میں لگ جاتی ہے یہ ہر قسم کا کام کرتی ہے۔ رات کی تاریکی کو دور کر کے ہمارے کمرے روشن کرتی ہے۔ ہمیں گرمی سے بچاتی ہے۔ ہمارے کمرے کو ہماری خواہش کے مطابق گرم یا سرد کرتی ہے۔ گھنٹیاں بجاتی ہے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ایک لمحے میں پیغام پہنچاتی ہے۔ کپڑے دھونے، نچوڑنے اور استری کرنے کے لئے بجلی استعمال کی جاتی ہے۔ دریوں اور قالینوں کو بجلی کی جھاڑو سے صاف کیا جاتا ہے۔ جہاز، ریل گاڑی اور موٹر بجلی کی مدد سے چلتی ہیں۔ ایک منزل سے دوسری منزل تک اترنے چڑھنے کے لئے بجلی کی لفٹ استعمال کی جاتی ہے۔ بجلی کوئی مادی شے نہیں بلکہ حرارت کی طرح ایک قوت یا اثر کا نام ہے۔ اس کا نام ایک یونانی لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی عنبر کے ہیں۔ یونانیوں کو معلوم تھا کہ عنبر کو جب رگڑا جائے تو ہلکی چیزیں مثلاً تنکے اور بھوسہ اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سائنس دانوں نے مزید مشاہدے شروع کئے اور بجلی کے متعلق ہمارا علم بڑھنے لگا۔ اگرچہ بجلی اور اس کی پراسرار خاصیتیں ابھی تک سائنس دانوں کے لئے محض ایک دلچسپی کا ذریعہ تھیں۔ گزشتہ سو سال کے دوران میں یہ معلوم ہا ہے

کہ وہ تمام اشیاء جنہیں ہم ٹھوس کہتے ہیں دراصل ٹھوس نہیں ، بلکہ انہیں ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ صرف مثبت اور منفی بجلی کے ذخیرے ہیں۔ ہر ایک چیز کی نوعیت کا انحصار بجلی کے ان ذخیروں کی ترتیب و تعداد پر ہوتا ہے جس مادے میں یہ ذخیرے بہت کثرت سے ہوں اس میں بجلی بآسانی گزر سکتی ہے۔ تانبا بجلی کے گزرنے کے لئے بہترین مادہ ہے۔ اسی لئے بجلی کے تمام تار تانبے کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ربڑ ، لکڑی اور چینی مٹی جیسے مادے بجلی گزارنے کے لئے اتنے کمزور ہیں کہ ان کا استعمال بطور بجلی روکنے کے آلات کے ہوتا ہے۔ ربڑ کے تلوے والے جوتے پہن کر بجلی کے تار پر کھڑے ہو جائیں تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض مادے مثلاً کاربن بجلی گزارنے کے لئے اتنے کمزور ہیں کہ بجلی کی رو جب ان میں سے گزرتی ہے تو وہ بہت مزاحمت کرتے ہیں اور گرمی سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ بجلی کے بلب بھی اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔ بجلی کی رو دو طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ رگڑ سے اور کیمیائی عمل سے۔ اگر شیشے کی ایک سلاخ کو ریشم کے کپڑے سے رگڑ کر کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے قریب لے جایا جائے تو ٹکڑے سلاخ سے چمٹ جائیں گے۔ اسی طرح گھاس کے تنکے بھی چمٹ جاتے ہیں اور پھر گر پڑتے ہیں اس رگڑ سے شیشے کی سلاخ میں بجلی کی ہلکی سے رو پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں انجنوں کے ذریعے بجلی پیدا کی جاتی ہے اور بعض جگہ پانی کی تیز روانی سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔

ذمے دار

صدف سراج

"کرمو! ارے او کرمو!" چارپائی پر بیٹھی کرمو کی بیمار ماں نے لرزتی آواز میں کرمو کو پکارا۔ کرمو دوڑا دوڑا کمرے میں داخل ہوا اور ماں کی حالت دیکھ کر دُکھ

کے سائے اس کی آنکھوں میں لہرا گئے۔ آج دو ہفتے ہوگئے تھے کہ ماں نے چارپائی پر سے قدم بھی نیچے نہ رکھا تھا، اس کی دوائی تو کیا گھر میں دو وقت کھلانے کو روٹی بھی نہ تھی، اس کا پھلوں کا ٹھیلا مالک مکان نے چھ مہینے ادا نہ کرنے پر ضبط کر لیا تھا۔ محلے والوں نے بھی اسے قرض دینے سے انکار کر دیا تھا۔ گھر کی تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ بھی ماں کی بیماری پر خرچ ہو گئی تھی۔ گھر میں آٹھ افراد تھے ایک وہ، ایک اس کی ماں اور چھ بہنیں۔ گھر کا واحد کمانے والا وہ ہی تھا۔ باپ تو اس کے پیدا ہوتے ہی انتقال کر گیا تھا۔ ماں نے بڑی مشکلوں سے محلے کے گھروں میں کام کر کے اسے

جوان کیا تھا۔ لیکن جب سے ماں پر فالج گرا تھا، ساری ذمہ داریوں کا بوجھ کرمو پر ہی آگیا تھا۔ ابھی اسے اپنی دو جوان بہنوں کا بیاہ بھی کرنا تھا، مگر حالات تھے کہ تنگ سے تنگ ہوتے چلے جارہے تھے اور اب اس کی بیروزگاری نے گھر میں فاقے شروع کروا دیئے تھے۔ کرمو کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ روزگار کی تلاش میں دن بھر مارا مارا پھرتا مگر زمانہ تو پیٹ بھروں کا پیٹ بھرنے کا عادی ہے۔

آج جب تھکا ہارا کرمو گھر میں داخل ہوا تو ماں کی کھانستی ہوئی آواز اور معصوم بہنوں کے بھوک سے بدحال چہرے دیکھ کر وہ بے چین ہوگیا۔

ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور موذن کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ مسجد روانہ ہوگیا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ خاموش قدموں کے ساتھ سڑک پر چلا جارہا تھا کہ اچانک اسے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک شخص قریبی جھاڑیوں میں سڑک کے ایک طرف پڑا ہوا درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کے منہ اور جسم پر لاتعداد چوٹوں کے نشان تھے۔ کرمو نے فوراً اسے اٹھایا اور قریبی دواخانے میں لے گیا۔ اس کی مرہم پٹی کرانے کے بعد کرمو نے اس سے ماجرا پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ رات کے آخری پہر تین غنڈے اس کے گھر میں داخل ہوئے اور اسے پکڑ کر باہر لے آئے۔ انہوں نے لاتوں، مکوں اور گھونسوں سے اس کی پٹائی کی اور جھاڑیوں میں پھینک کر بھاگ گئے۔ اس نے کرمو کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس سے کہا کہ اسے جب بھی کوئی مشکل ہو تو اس کے پاس فوراً چلا آئے۔ کیونکہ وہ ایک امدادی انجمن کا صدر ہے۔ کرمو کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اللہ نے اس کے لئے رحمت کا فرشتہ بھیج دیا ہو۔ کرمو نے اسے اپنے مسائل کے متعلق بتایا اور درخواست کی کہ وہ اسے اتنے پیسے قرض دے دے کہ وہ اپنا ٹھیلا مالک مکان سے چھڑا سکے اور اپنی ماں کا علاج کرا سکے۔ وہ شخص رضامند ہوگیا اور اسی وقت کرمو کے قرض کی ادائیگی کر کے اسے کچھ پیسے ماں کے علاج کے لئے دے دیئے۔ کرمو کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بار بار شکر ادا کرتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے یہ خوشخبری اپنی ماں کو سنائی جسے سن کر ماں کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ سب بچوں کے چہرے خوشی سے کھل گئے۔ کرمو تیز تیز قدموں سے بازار روانہ ہوگیا۔ راستے بھر وہ منصوبے بناتا رہا۔ سب سے پہلے اس نے ماں کی دوائی خریدی پھر کھانے کا کچھ سامان لیا اور پھر منڈی سے پھل خریدے انہیں خوبصورتی سے اپنے ٹھیلے پر سجایا اور آواز لگاتا سڑک پر نکل آیا۔ اس نے سوچا گھر پہنچنے تک کچھ پھل بیچ دے۔ آج اس کی آواز بہت تیز تھی، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ جیسے ہی بڑی سڑک پر آیا۔ ایک ہنگامہ شروع ہوگیا لوگ ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔ ٹریفک ایک دم تیز ہوگیا کرمو کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ اچانک اس نے اعلان سنا کہ شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر کرمو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اپنی بیمار ماں کا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ حالات کیا سے کیا ہوجائیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی زندگی میں جو پھول کھلے تھے اب مرجھا رہے تھے۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ گھر پہنچنا اس کے لئے مشکل ہوگیا تھا۔ جب وہ لرزتا ہانپتا گھر پہنچا تو سارے گھر والے پریشان تھے۔ ایک سناٹا طاری تھا۔

اس نے ٹھیلا ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور حسرت بھری نظروں سے اپنے ٹھیلے کو دیکھنے لگا جسے پاکر بھی وہ کچھ نہیں کما سکتا تھا۔ کرفیو لگے پورا دن گزر گیا۔ اس کے خریدے ہوئے پھل سڑنے لگے۔ دوسرے دن بھی کرفیو نہ کھلا۔ ماں کی دوائی بھی ختم ہوگئی۔ آج کرمو کو اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ شہر میں ہنگامے بڑھتے جارہے تھے اور گھر میں ماں کی حالت خراب سے خراب ہوتی جارہی تھی اور آخر کب تک۔ رات کے وقت ماں کو کھانسی کا ایسا دورہ پڑا کہ وہ ادھ موئی ہوگئی۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی، ایسے میں سارے دواخانے بھی بند تھے۔ کرمو فوراً ماں کو لے کر اسپتال بھاگا۔ مگر کوئی سواری نہ تھی۔ کرمو نے ماں کو اپنے ٹھیلے پر ڈالا اور سپاہیوں سے اجازت لیکر اسپتال روانہ ہوگیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے پاؤں پہیے بن جائیں اور وہ اسپتال پہنچ جائے۔ مگر اس کی ساری کوششیں بیکار گئیں۔ اس کے قدم کسی سواری کا مقابلہ بھلا کیسے کرسکتے تھے۔ تین ہفتوں کی بھوکی۔ پیاسی بیمار ماں نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ کرمو شدت غم سے بے دم ہوکر سڑک پر گر پڑا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے اوسان درست ہوئے تو وہ اپنی ماں کی لاش لیکر گھر کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے دماغ میں سوالات پر سوالات آتے جارہے تھے۔ اس کی ماں کی موت کا ذمہ دار کون تھا؟ اس کی غربت، ہنگامہ، کرفیو، یا کچھ اور؟ کرمو کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا شاید وہ کبھی بھی نہ پہنچ سکے۔

"آپ کتنے پانی میں ہیں؟"

مرسلہ۔ انیلا سلطان، کراچی

(۱) ذرا بتایئے تو وہ کیا ہے کہ جو شخص اسے تیار کرتا ہے اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی، جو اسے خریدتا ہے وہ اسے خود استعمال نہیں کرتا اور جس کے استعمال میں یہ آتا ہے وہ اس کے بارے میں کسی کو بتاتا نہیں۔

(۲) ایک گڑھا جو ایک فٹ لمبا، ایک فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا ہے، بتایئے اس میں سے کتنے مکعب فٹ یا کتنے کلو مٹی نکلے گی؟

(۳) ذرا یہ تو بتائیں کہ کہاں جون، جولائی کے بعد اور جولائی، اگست کے بعد آتا ہے؟

(۴) اسلم، شاہد کا کزن ہے۔ شاہد، سلیم کا کزن ہے۔ اسلم، سلیم کا کزن نہیں ہے۔ بتایئے کیسے؟

(۵) انگریزی کا وہ کون سا ۱۴ حرفی لفظ ہے جس میں ایک ہی (vowel) چھ مرتبہ استعمال ہوا اور اس (vowel) کے علاوہ کوئی اور (vowel) استعمال نہیں ہوا؟

(۶) واجد، ساجد اور ماجد تین بھائی ہیں۔ واجد کا بیان ہے "میں ساجد سے دو سال بڑا ہوں۔" ماجد کا بیان ہے "واجد مجھ سے دو گنا بڑا ہے۔" ساجد کا بیان ہے "ماجد مجھ سے چار سال چھوٹا ہے۔" کیا آپ واجد کی عمر بتا سکتے ہیں؟

(۷) مومن خان مومن نے اپنے ایک دوست کے نام کی پہیلی کہی تھی۔

بنے کیونکر کہ ہے سب کا یار الٹا
ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا

بتایئے ان کے دوست کا نام کیا تھا؟ (آپ کی آسانی کے لئے اتنا بتادیتے ہیں کہ ان کے دوست کا نام دوسرے مصرعے میں پوشیدہ ہے اور جو لفظ اس شعر میں سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے وہ کافی اہم

ہے)۔

(۸) آپ کی والدہ کے اکلوتے بھائی کی اکلوتی بہن کی صرف ایک اولاد ہے۔ بتائیے اس کا آپ سے رشتہ کیا ہے؟

جوابات

(۱) کفن (۲) مکعب فٹ اور کلو میں الجھ گئے نا؟ بھئی جب گڑھا پہلے سے ہی موجود ہے تو مٹی کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) لغت (ڈکشنری میں) (۴) اسلم شہلا کا ماموں زاد بھائی ہے۔ سلیم، شہلا کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ چنانچہ سلیم اور اسلم آپس میں کزن نہیں ہیں۔

(۵) INDIVISIBILITY (۶) بارہ سال۔ (۷) مہتاب رائے۔ لفظ الٹا زیادہ استعمال ہوا ہے، لہٰذا ظاہر ہوا کہ دوسرے مصرعے میں کچھ الفاظ کو الٹنے سے ان کے دوست کا نام بن جائے گا۔ "ہم" کو الٹا کیا تو م ہ آیا۔ بات کو الٹا کیا تو ت ا ب ہوا، مل کر بنا مہتاب۔ یار کو الٹا کیا تو بنا رائے، چنانچہ ان کے دوست کا نام ہوا مہتاب رائے۔ (۸) آپ خود ہیں۔

معلومات کوئنز

مرسلہ۔ عمر خطاب خان۔ کراچی

(۱)..... پاکستان کا سب سے چھوٹا دریا "دریائے راوی" ہے۔

(۲)..... امریکہ کے صدر کینیڈی کو ۱۹۶۳ء میں قتل کیا گیا۔

(۳)..... ہمایوں شہنشاہ بابر کا بیٹا تھا۔

(۴)..... ہمایوں کابل میں پیدا ہوا۔

چھابڑی والا

محمد نوید مرزا۔ لاہور

سر پر اپنے بوجھ اُٹھائے
گلی گلی میں پھرتا ہے جو
وہ ہے اک افلاس کا مارا
چھابڑی اپنے سر پر رکھ کر
لوگوں کی جیبوں کو ٹٹولے
اُس کے سر پہ بوجھ ہے گھر کا
بھوک سے بچے بلک رہے ہیں
کھٹی میٹھی باتیں سُن کر
چُپ سا ہو کر رہ جاتا ہے
پندرہ گھنٹے محنت کر کے
لے جاتا ہے گھر کچھ سکّے
اس پر بھی صابر رہتا ہے!
اپنے کُنبے کی خاطر وہ
ہر پل کیا کیا دُکھ سہتا ہے!

بلیک بکس

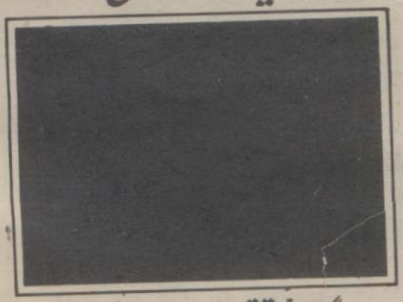

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے۔"

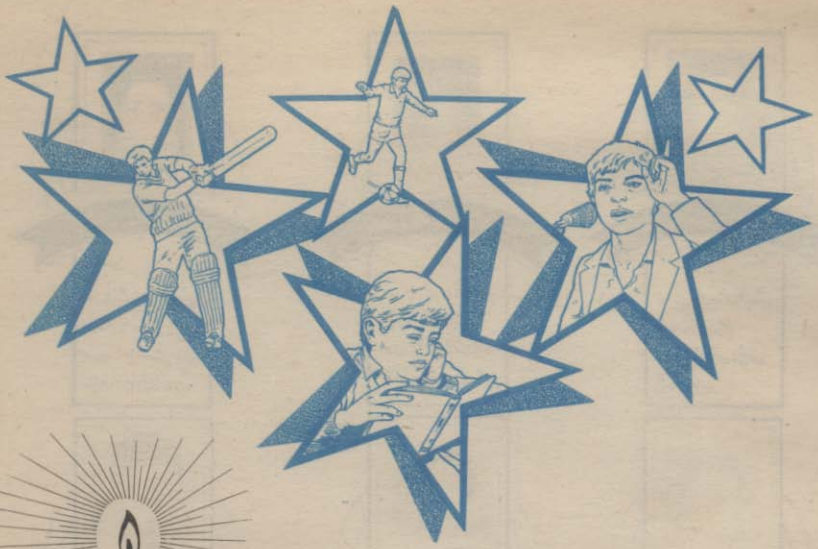

روشن مثال

ان ساتھیوں کا تعارف

جنہوں نے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو

THE PICK OF THE MONTH

رفعت سجاد

ہر جماعت میں اوّل پوزیشن، میٹرک اے ون گریڈ

۱۶ سال، بارہویں، تقریر کرنا، مطالعہ، مصوری، پڑھانا، ٹکٹ اور سکّے جمع کرنا، باغبانی، کہانیاں لکھنا، ٹیبل ٹینس اور بیڈمنٹن کھیلنا، کراچی

نعیم احمد ادیب

میٹرک میں اے گریڈ

۱۸ سال، بارہویں، کتب کا مطالعہ، اناٹمی
سی بی ۵۸۰ الجلا سوسائٹی
شاہ فیصل کالونی، کراچی

فیصل حمید فاروقی

میٹرک مکینیکل میں اے ون گریڈ

۱۶ سال، میٹرک، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، بہترین کتب کا مطالعہ، انگلش
۱۸/۳ بی ایریا لیاقت آباد
کراچی نمبر ۱۹

کاشف مظہر

میٹرک میں اے ون گریڈ

۱۹ سال، گیارہویں، انگلش فلمیں مطالعہ کرنا، حساب
۱۸۱ ایم، عیر سٹی مسلم آباد
کراچی نمبر ۲۳، پوسٹ کوڈ ۷۵۰۵۰

فیصل اقبال صدیقی

اسکاؤٹنگ میں سرٹیفکیٹ

۱۳ سال، نہم، ڈاک ٹکٹ جمع کرنا، انگلش
مکان نمبر ۲۲۴ معرفت محمد حسین کھیوڑا
کالونی غریب آباد، حیدر آباد

محمد ناصر عظیم جشتی

مڈل سٹینڈرڈ کے امتحان میں تحصیل بھر میں اوّل پوزیشن

۱۵ سال، دہم، سائنسی و تفریحی کتب کا مطالعہ، کرکٹ، ریاضی
محمد ناصر عظیم جشتی۔ تیس باغ خورد
اٹک شہر، پنجاب

رافع احمد

اوّل تا ہشتم اوّل پوزیشن

۱۳ سال، ہشتم، رسالے پڑھنا ٹکٹ سکے جمع کرنا، کمپیوٹر سائنس
رفیع احمد ولد ایئر کموڈور رشید جتی
۴ ر ۵۲ آفیسرز میس پی اے ایف مسرور کراچی

عدنان الحق

پہلی سے پنجم تک اوّل پوزیشن

۱۲ سال، ششم، کرکٹ، ریاضی،
پوسٹ بکس نمبر ۳۲۵۴
دوحہ قطر

محمد کامران فیصل

اسکاؤٹنگ میں ٹرافی

۱۵ سال، دہم، مطالعہ، پرندے پالنا، باغبانی، انگلش
مکان نمبر ۱۱۴ اے دیوان واس اسٹریٹ
پرانا سکھر سندھ

محمد عاطف نواز

میٹرک میں فرسٹ ڈویژن

۱۶ سال، فرسٹ ایئر، کتب جمع کرنا، انگلش
۳۵، پی، گلشن کالونی
فیصل آباد

آپ کی تصویر اس فریم کے سائز میں کٹی ہوئی ہونی چاہیئے۔ چھوٹی یا بڑی تصویر قابلِ قبول نہ ہوگی

اس تعارفی سلسلے میں صرف وہی ساتھی شریک ہو سکیں گے جنہوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں کام یا اہم کامیابی حاصل کی ہو مثلاً۔ امتحان میں پوزیشن، مختلف نوعیت کے مقابلوں میں کامیابی، کوئی اہم سماجی کام، کوئی اور کارنامہ.....

○ ..... اپنی کامیابی کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے ضرور کروائیں ورنہ تعارف شائع نہ ہو سکے گا۔

○ ..... آپ کی تصویر ایک خاص سائز میں مطلوب ہوگی۔ سائز کے لئے ایک فریم شائع کیا جارہا ہے۔ تصویر اس سائز سے بڑی ہو نہ چھوٹی۔ تصویر صاف کٹی ہوئی ہو ورنہ کسی طور شائع نہ ہو سکے گی۔

یاد رہے ! ہر ماہ شائع ہونے والے تعارف میں سے بہترین اور زیادہ باصلاحیت ساتھی کو (BEST OF MONTH) کا خطاب دیا جائے گا اور اس کا تعارف ٹیلی ویژن سمیت مختلف اداروں کو بھجوایا جائے گا تاکہ اس کی صلاحیتوں کو قومی سطح پر متعارف کروایا جاسکے۔

○ ..... پرائمری سے بارہویں تک کے طلباء وطالبات اس میں شریک ہو سکتے ہیں مگر طالبات کے پتے شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ○ ..... کوپن کا آنا شرط ہے جو صفحہ نمبر ۱۳۹ پر موجود ہے۔

آنکھ مچولی بُک بینک

ہم نے اپریل کے شمارے میں آنکھ مچولی بُک بینک کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ الحمدللہ اس سلسلے میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ذیل میں چند ساتھیوں کے پتے اور کتابوں کی تفصیل شائع کی جارہی ہے۔ ضرورت مند قارئین اپنی مطلوبہ کُتب صرف ڈاک خرچ بھیج کر ان ساتھیوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱) **محمد عاقل احمد خاں** : مکان نمبر ۴۸۱۔ اے شاہی بازار پرانا سکھر پوسٹ کوڈ ۶۵۲۰۰

(نویں جماعت سائنس گروپ کا کورس)

(۲) **محمد شاھد توگیر وی**:۔ محمد شاید گیروی انچارج دفتر عمر فاروق رضؓ ویلفیئر سوسائٹی گلشن اقبال میلاد چوک ہارون آباد، ضلع بہاولنگر

(پانچویں کلاس سے کردہم جنرل وسائنس گروپ تک کورس)

(۳) **احمد علی** :۔ معرفت شاہ عالم مکان نمبر ۱۲۲۔ بلاک ای سیکٹر ۱، کراچی

(نویں جماعت سائنس گروپ کا کورس)

(۴) **زرین شاہ** :۔ ۱۱۴۷ - آر، بلاک نمبر ۱۶، فیڈرل بی ایریا، کراچی

(ششم، ہشتم کا مکمل کورس)

کوپن کا صفحہ

آنکھ مچولی کے مختلف مقابلوں یا تحریری سلسلوں میں شرکت کے لئے جابجا کوپن چھاپنے سے رسالے کے بدنما ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اسی لئے تمام کوپن اس صفحے پر یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

آنکھ مچولی کی سالانہ خریداری کا کوپن

نام _____ کلاس _____ عمر _____

ارسال کردہ کل رقم _____ بذریعہ _____ دستخط _____

پتا _____

غزل پزل میں شرکت کا کوپن

نام _____ عمر _____ کلاس _____

پتا _____

جواب نمبر ① _____ ② _____ ③ _____ ④ _____ ⑤ _____

⑥ _____ ⑦ _____ ⑧ _____ ⑨ _____ ⑩ _____

نام _____ عمر _____ جماعت _____

مشاغل _____ پسندیدہ مضمون _____

کوئی اہم کامیابی _____

پتہ _____

امّی ابو کا صفحہ

اُمِّ رمیصاءؒ

نئی نسل کی کردار سازی
اور تربیت کے لئے راہ نما خطوط

بچوں میں بناؤ یا بگاڑ کے عمل کو تحریک اسی ماحول سے ملتی ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے وہ زیادہ تر گھر ہی میں رہتا ہے اور اس کا بیشتر وقت والدین کے ساتھ گزرتا ہے گویا گھر اس کا پہلا کلاس روم ہے اور والدین اس کے پہلے مدرّس ......

بچہ گھر میں والدین کی گفتگو سنتا ہے، ان کی حرکات دیکھتا ہے، ان کے رویّوں کا سامنا کرتا ہے اور فطرت بچے کو سکھاتی ہے کہ وہ والدین کے ہر عمل سے کچھ نہ کچھ سیکھے، کچھ نہ کچھ اخذ کرے۔ یوں بچہ محسوس یا غیر محسوس طریقے سے سیکھتا چلا جاتا ہے اب اس بات میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ والدین کے رویّے، گفتگو یا طرزِ عمل ہی بچے کی شخصیت میں بناؤ یا بگاڑ کی بنیاد ہے۔

بچے کی تربیت کی ضمن میں وہ بہت سی غلطیاں جو والدین سے سرزد ہوجاتی ہیں۔ ہم وقتاً فوقتاً اس پر توجہ دلاتے رہتے ہیں آج جس اہم غلطی کی جانب آپ کی توجہ مبذول کروانا مقصود ہے وہ ہے۔ وعدہ خلافی۔

ہم اپنے روتے ہوئے بچے کو چپ کروانے کے لئے بچے کو اس کی ہٹ دھرمی سے بعض رکھنے کے لئے یا اس کے کسی اصرار پر، وقتی طور پر اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر کوئی وعدہ کر لیتے ہیں مثلاً یہی کہ ہم تمہیں فلاں چیز لے دیں گے، سیر کروانے لے چلیں گے یا کچھ اور ...... لیکن پھر بہت جلد ہم یہ وعدہ بھول جاتے ہیں۔ اپنے اس عمل سے ہم نے بچے کو جو کچھ سکھایا وہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ۔

- ...... وعدہ محض ٹال مٹول قسم کی کوئی چیز ہے۔
- ...... ہمارے وعدے پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔
- ...... تم چاہو تو تم بھی وعدہ خلافی کر سکتے ہو گویا جھوٹ بول سکتے ہو۔

ہماری معمولی سے غلطی بچے کی شخصیت میں کہیں پر خفیف سی مگر منفی تبدیلی پیدا کر دیتی ہے ......
یہ تبدیلی جو آگے چل کر بڑا روگ بھی بن سکتی ہے ...... اس کا ذمہ دار کون؟ بچہ یا والدین؟؟

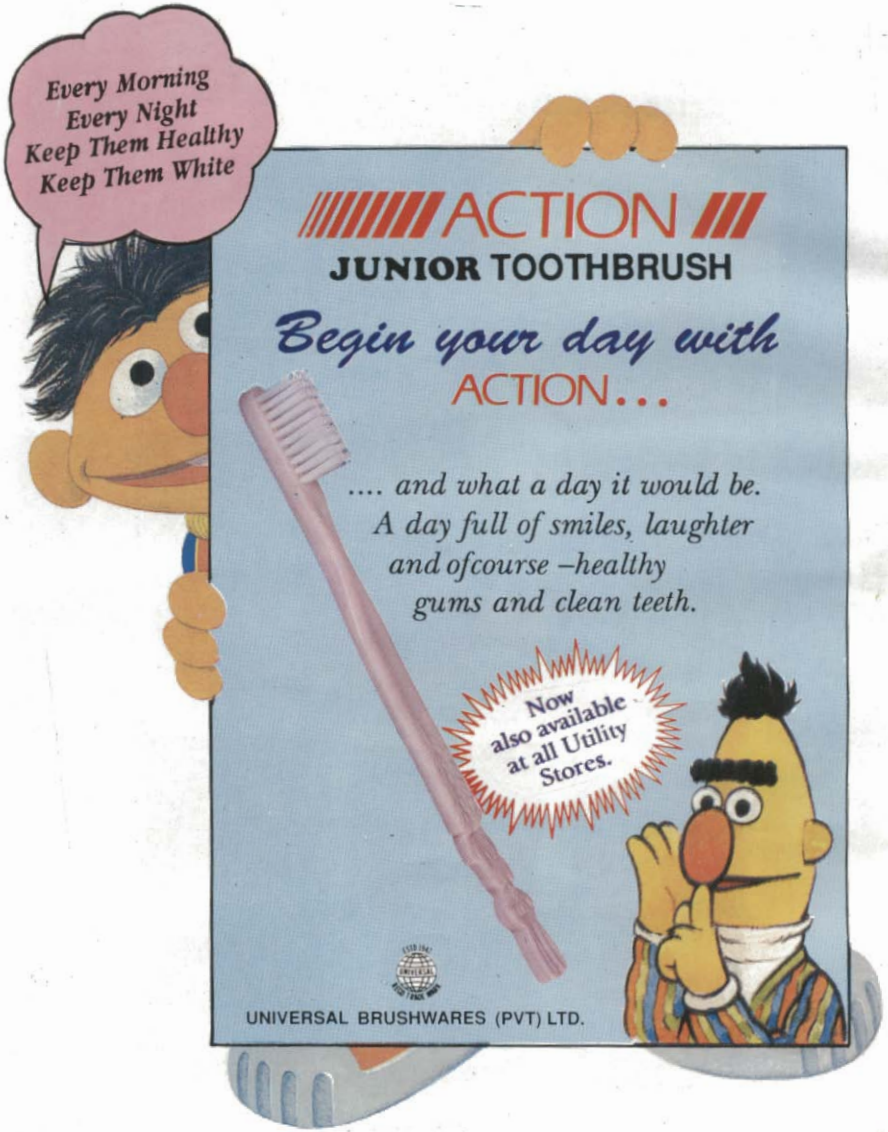

Every Morning
Every Night
Keep Them Healthy
Keep Them White
ACTION
JUNIOR TOOTHBRUSH
Begin your day with
ACTION...
.... and what a day it would be.
A day full of smiles, laughter
and ofcourse –healthy
gums and clean teeth.
Now
also available
at all Utility
Stores.
UNIVERSAL BRUSHWARES (PVT) LTD.

REGD. No. M-266 OCTOBER 1990

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

جام جیلی مارملیڈ

اب نئے انٹرنیشنل پیک میں

قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا